ناول

فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰ء

شفقؔ سوپوری

فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰ء

(ناول)

ڈاکٹر شفق سوپوری

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

FIRING RANGE: KASHMIR 1990

(Novel)

by

Dr. Shafaq Sopori
1/101, Highland Enclave, Gogo Humhama
Near International Airport Budgam 190021(J&K)
Contact No: 9419001693, 7006828727
E-mail: drshafaqsopori333@gmail.com

Year of Ist Edition 2019
ISBN 978-93-88736-67-1
Price Rs. 300/-

نام کتاب : فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰ (ناول)
مصنف : ڈاکٹر شفق سوپوری
سالِ اشاعت اوّل : ۲۰۱۹ء
تعداد : ۵۰۰ (پانچ سو)
قیمت : ۳۰۰ روپے
سرورق : جاوید اقبال (سوپور)
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے:

☆ شب خون کتاب گھر، پوسٹ بکس 13، الہ آباد 211003 (یوپی)
☆ میزان پبلشرز، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر
☆ کتاب گھر، مولانا آزاد روڈ، سرینگر، کشمیر ☆ گلشن بکس، ریذیڈنسی روڈ، سرینگر، کشمیر

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, 45678286 Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

- اپنے والدِ نسبتی غلام نبی شاپو کے نام جن کا یکم اکتوبر سال ۱۹۹۰ کو ہندواڑہ میں دیگر چودہ معصوموں کے ساتھ بہیمانہ قتل کیا گیا۔
- اپنی والدۂ نسبتی امینہ بیگم کے نام جن کی مانگ عین جوانی میں خاک سے بھر گئی۔
- اپنے برادرانِ نسبتی ارشد حسین شاپو اور بلال احمد شاپو کے نام جنہوں نے اپنے والد کی نیم سوختہ میّت قتلِ عام کے دوسرے دن راکھ کے ڈھیر سے نکال کر قبرستان تک کاندھا دے کر پہنچائی۔
- اپنی بیگم ریحانہ اختر کے نام جنہیں اپنے والد کا آخری دیدار بھی نصیب نہ ہوا۔
- زندہ دلانِ ہندواڑہ کے نام جنہوں نے مقتول کے پسماندگان کو ان کے آبائی وطن ڈورو (اننت ناگ) واپس جانے سے یہ کہہ کر روکا کہ جہاں مقتول کا جسدِ خاکی آسودہ ہے وہیں اس کا خاندان بھی رہے گا۔

(شفق سوپوری)

مصنّف کی دیگر تصانیف

- دلِ خاک بسر (مجموعہ غزلیات)
- بیتے موسموں کے دُکھ (گیت اور نظمیں)
- دشت میں دور کہیں (مجموعہ غزلیات)
- اُردو غزل اور ہندوستانی موسیقی (تنقید و تحقیق)
- موسیقی، شاعری اور لسانیات (تنقید و تحقیق)
- مخزنِ موسیقی (تحقیق)
- جہات (تنقید و تحقیق)
- کلامِ فیض کا عروضی مطالعہ (تحقیق)
- غ۔م طاؤس: فن اور شخصیت (تنقید و تحقیق)
- نیلیما (ناول)
- شگفتانے (طنز و مزاح)

فائرنگ رینج: کشمیر: ۱۹۹۰

''اردو ناولوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل''

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

شاعری تو زمانی اور زمینی حوالوں سے ارتقاع کے راستے نکال لیتی ہے مگر فکشن اپنے گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر رہتا ہے۔ برصغیر کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی صورتِ حال کی غیر معمولی پیش کش تقسیمِ ہند پر مبنی اردو ناولوں نے تقریباً دو عشرے تک انجام دینے کا ثبوت دیا مگر گزشتہ تین دہائیوں میں کشمیر کی سرزمین نے جو کچھ دیکھا اور جس طرح جبر و تشدّد، دہشت ناکی اور غیر انسانی صورتِ حال کا تجربہ کیا اُس سے اردو فکشن کی لاتعلقی اور لاپرواہی باعثِ حیرت ہی نہیں، باعثِ غیرت بھی بن کر رہ گئی ہے۔

شفقؔ سوپوری ایک ممتاز اور منفرد شاعر کے طور پر کچھ اتنے مصروف ہیں کہ اُن کی دوسری متنوع صلاحیتیں نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے نثر نگار اور اردو فکشن کی روایت اور مضمرات کے رمز شناس بھی ہیں، جس کا بہترین ثبوت وہ گزشتہ برسوں میں ایک قابلِ توجہ ناول ''نیلیما'' لکھ کر دے چکے ہیں۔ شفقؔ سوپوری کی افتادِ طبع: ''ہر لحظہ نیا ذوق نئی برقِ تجلّی'' کے مصداق اپنے تخلیقی محرکات کے انکشاف کی متلاشی رہتی ہے۔ انہوں نے ''فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰'' کے نام سے تازہ ترین ناول لکھ کر ایک پختہ کار ناول نگار ہونے کا ثبوت فراہم تو کیا ہی ہے اپنے ضمیر کی آواز

پر لبیک کہنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ضمیر کی اِس آواز کا تعلق انسانی سروکار، سماجی ذمہ داری اور اخلاقی فریضے سے بھی ہے۔ کشمیر کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال جس طرح برِّصغیر کے دو ملکوں کی غیر فطری تقسیم کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہے اِس کی حرکیات کو فکشن سے بہتر طور پر کسی اور صنفِ ادب اور اسالیبِ اظہار میں پیش ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شفیق سوپوری نے انسانی ضمیر کے ساتھ بحیثیتِ مجموعی اردو فکشن پر عائد اِس قرض کو چکانے کی کوشش کی ہے جو محض کشمیر پر ہی نہیں پورے برِّصغیر میں اردو کے بیدار مغز ادیبوں پر عائد تھا۔

شفیق نے نہ صرف اس تمام صورتِ حال کا مشاہدہ کیا ہے بلکہ ان کے عزیز و اقارب نے براہِ راست اِس کرب اور اذیّت کو بھگتا اور تجربہ کیا ہے جو پسماندگان کے لئے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح ہنوز اُن کے اعصاب پر مسلّط ہے۔ ظاہر ہے کہ شفیق سوپوری سے زیادہ مؤثر انداز میں اِس موضوع کا حق ادا کرنے کا ثبوت کسی اور کے لئے پیش کرنا آسان نہ تھا۔

مصنف نے اپنے شاعرانہ تخیّل اور بیانیہ کی قوت کو بھرپور طریقے سے اِس ناول میں رو بہ عمل لانے کی کوشش کی ہے۔ اِس بیانیہ کا واحد متکلم راوی بیانیہ کا حصّہ بھی ہے اور پوری صورتِ حال سے فنّی اور معروضی فاصلہ قائم رکھنے میں کامیاب بھی۔ اِس ناول کے مرکزی کردار منظور احمد شاہ، خواجہ احمد قدوس، نور الدّین شاہ اور قادر کانچی کے ساتھ ترکوک ناتھ کول اور کرتار سنگھ کے کردار کی پیش کش ایک طرف ناول نگار کے لبرل نقطۂ نظر کی عکاسی بھی کرتی ہے اور کسی نوع کے اکہرے طرزِ فکر کا اس پر عائد نہیں ہونے دیتی۔ مزید

برآں یہ کہ زبان و بیان کی شگفتگی اور حسِ مزاح نے اس ناول کو حد درجہ قابلِ مطالعہ بھی بنا دیا ہے۔

راقم الحراف کو امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ یہ ناول اردو ناولوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل بھی ثابت ہوگا اور اپنے منفرد بیانیہ کی حیثیت سے نا قابلِ فراموش بن جائے گا۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

''سرسبز'' علی گڑھ

۵۔فروری ۲۰۱۹

باب یکُم

''آن ــــ تے رے ناری نوم'' (۱)

اللہ اکبر
اللہ اکبر
اللہ اکبر

سرینگر کے ایک مضافاتی علاقہ کی مسجد کا لاؤڈ سپیکر گرجنے لگا۔ دسمبر کی رات کا زرد چاند دھندلے آسمان پر پیلی روشنی کی چادر میں ٹھٹھر رہا تھا۔ اچانک فوجی بنکروں سے دودھیا روشنی کے تند، تیز اور نکیلے دھارے بہنے لگے۔ مٹیالے مکانوں کی نیم خوابیدہ دیواریں چندھیا گئیں اور دھند میں چھید کرتی ہوئی روشنی کے پھندے آواز میں پڑ گئے۔

''حضرات! حضرات!! حضرات!!!''

سرینگر کی کسی بستی میں آگ لگا دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سربسجود ہو کر عتاب زدگاں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی لئے

---

(۱): ہندوستانی موسیقی کی معروف صنف ''ترانہ'' کا ایک بول۔

دعامانگیں۔

''اللہ اکبر!''

اس کے بعد دیر تک شہر میں روشنی کے تند، تیز اور نکیلے دھاروں نے گرجتے ہوئے نعروں کا تعاقب کیا:

''اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر''

باطل سے مٹنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار لے چکا ہے تُو امتحاں ہمارا

''اللہ اکبر! حضرات! حضرات!! حضرات''

''نہ گھبراؤ مسلمانو! خدا کی شان باقی ہے''

''اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقتِ شہادت ہے آیا''

اللہ اکبر

اور جو کتیا بڑی دیر سے دھاڑتے ہوئے رو رہی تھی، روشنیوں اور آوازوں کے بھنور میں یوں چکرائی کہ ایک دکان کے تھڑے تلے دبک کر بیٹھ گئی۔

دور سے لگ رہا تھا کہ جیسے آتش فشاں پھٹ گیا اور زمین اپنا سینہ چاک کر کے لاوا ابل رہی ہے۔ بھیانک شعلوں کی تیز زبانیں آسمان کو چاٹ رہی تھیں۔گلریز کالونی کے خوف زدہ مکین کھڑکیوں کے شیشوں سے اپنی گرم سانسوں کی دھند ہٹاتے ہوئے گہرے بھورے رنگ کی روشنی میں دہشت کھائی ہوئی گلیوں میں مضطرب ہو کر جھانک رہے تھے۔سناٹا اس قدر گہرا کہ

بچّوں کے منمنا کر بولنے اور بزرگوں کے گھٹنوں کے چٹخانے کی آواز کے صدمے سے دلوں کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔

آگ اسی بستی میں لگی تھی مگر بنکروں کے تنگ روزنوں سے نکلنے والی دودھیا روشنی کی لکشمن ریکھاؤں کو پار کرنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔کوئی نہیں جانتا تھا کہ آگ اُس کے گھر سے کتنی دور ہے۔بے بس آنکھیں کھڑکیوں کے گیلے شیشوں سے آسمان کی طرف لپکنے والے بھڑبھڑاتے شعلوں کے دامن سے لپٹی موٹی موٹی چنگاریوں کا دہشت ناک رقص دیکھ رہی تھیں۔مگر پنڈت جانکی ناتھ فوطیدار کے ہمسائے اُن کی بدنصیب ڈھنڈار حویلی کو راکھ ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔چھت جل چکی تو دہکتی ٹین کے چھلنی ٹکڑے ہوا کے زوردار جھکڑ سے ایک خوفناک گرج کے ساتھ ادھر اُدھر بکھر گئے........پھر دیواریں اڑاڑا کر گرنے لگیں۔

''ہائے فوطیداروں کی حویلی راکھ ہوا چاہتی ہے۔''

''کتنے سہاؤنے دن دیکھے ہیں اس حویلی نے۔''''اچھا ہوا منحوس حویلی جل گئی۔ہمیشہ کے لئے یہ ٹنٹا ختم ہوا۔نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔''''بڑے دکھ بھرے دن دیکھے اس حویلی نے کب تک آخر اس کی دیواریں دردناک چیخوں کی بے کفن لاشوں کا بوجھ بھگت لیتیں۔''

فوطیدار کے ایک ہمسائے نے اپنی کھڑکی کے طاق پر قرآن مجید رکھا۔تسبیح کے دانوں کی آسمانی جلترنگ سے اُس کی آنکھ لگ گئی اور وہ ایک

خواب دیکھنے لگا:

چولھوں پر رکھے ہوئے چائے کے پتیلوں میں پہلی سنسناہٹ ہوئی کہ سپاہی دندناتے ہوئے گھروں میں گھس گئے۔ گلیوں اور کوچوں میں بانس کے ڈنڈوں اور بندوق کے بٹوں سے مار مار کر اُنہیں میدان کی طرف ہانکا گیا۔ عورتیں کھڑکیوں پر بین کرتی رہیں۔ ہمکتے ہوئے بچّوں نے وہ غل مچایا کہ آسمان لرزنے لگا۔ رات کی بارش سے میدان بھیگ گیا تھا۔ گڑھے پانی سے بھر گئے تھے......... کیچڑ میں جوتوں کے ساتھ قرہ قلی ٹوپیاں کچر پچر ہوگئیں۔ پھر گیلے کپڑوں کو چھونے والے بجلی کے تاروں سے چنگاریاں اٹھنے لگیں اور درد بھری چیخوں سے فضا کا کلیجہ پھٹنے لگا۔

''کون تھا.........؟ کس حرامزادے نے پھونک دیا پنڈت کی حویلی کو؟ کمینو! بولتے کیوں نہیں؟ سانپ سونگھ گیا کیا؟ بول بے بڈھو! کہاں سے آئے تھے تیرے داماد؟ کہاں چھپایا؟ حرامخور! ڈھیل سالے! تُو شکل سے ہی اوگروادی کا سسر لگتا ہے۔''

اور تاؤ میں آکر ایک ''یدھمان'' نے بندوق اُس کے برہنہ سینے پر تان لی اور لبلبی دبادی۔ ایک دھماکہ ہوا اور اُس کے جگر کے چیتھڑے پشت کے درّے سے نکل کر کیچڑ میں ادھر اُدھر بکھر گئے۔ سنسنی سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ مسجد کا لاؤڈ سپیکر گونج رہا تھا۔

''الصلاۃ خیر من النوم'' (نماز نیند سے بہتر ہے)

اُسے جگر میں ہلکا سا درد محسوس ہوا۔اُس نے تسبیح سینے پر پھیر لی۔رحل پر کنول کی طرح چمکتے ہوئے قرآن مجید کو پلکوں سے چوم لیا۔

آج سے کچھ برس پہلے کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ سندوری خوشیوں سے دمکتی ہوئی اس حویلی کا انجام اسقدر عبرتناک ہوگا۔

''فوطیداروں کی حویلی جل کر راکھ ہوگئی''

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا

کریدتے ہو جواب راکھ ، جستجو کیا ہے

چھت کی جگہ آسمان کی طرف حیرت سے منہ کھولے ایک ہولناک گھاؤ جس میں سے ابھی ہچکیاں لیتا ہوا دھواں کشاں کشاں خارج ہوکر مغموم فضا میں کہیں گم ہو رہا ہے۔ایک دوسرے پر گری ہوئی دیواریں ادھ جلی چوکھٹوں سے لپٹ کر رو رہی ہیں۔حویلی کے گرداگرد اپنی ٹھنڈی چھاؤں کی تمام ممتا رتیں بسرا کر سیب، ناشپاتی، اخروٹ اور بادام کے ٹنڈ منڈ پیڑ دیکھ کر نمناک آنکھوں کو وہ دن یاد آیا جب جانکی ناتھ فوطیدار کی پوتی سرلا کی بارات آئی تھی۔ حویلی پر کتنی راتوں تک برقی قمقموں کی بیلیں جھلملاتی رہیں۔درختوں کی ٹہنیوں اور انگور کی ٹٹیوں پر موتی کی مالائیں لٹکتی رہیں۔جھانپ سے نکڑ تک سفید براق منڈھے کی چھت پر رنگارنگ فانوس چمکے، قناتوں کے کناروں پر پٹاپٹی کی گوٹ لگ گئی۔

اور جب بارات آئی تو پنڈتانیوں کے مدھم سروں میں ولمبت

''ون وُن''(۱) کے مقابلے میں مسلمان بیبیوں کے تیور سر جاگ اٹھے۔ایک لمبی سفید ڈاڑھی والے نے ڈپٹ کر کہا:

''شرم کرو شرم........یہ بھانڈ بھگیتوں کا کام ہے''۔

تو ایک بی بی نے اپنی اوڑھنی کی گانٹھ مضبوط کرتے ہوئے کہا:

''آج تو مت ٹوکو، ایک ہی تو پنڈت اس بستی میں ہے ایک ہی تو اُن کی بیٹی ہے لاڈلی۔لڑکے والوں کو پتہ تو چلے کہ بارات زندہ دلوں کے ہاں اتری ہے۔''

پھر تمبکناری (۲) کی درت تھاپ پر ترانہ بدن مچلنے لگے اور گلِ انار کی طرح دمکتی ہوئی ایک تیرہ تالی (۳) نے اپنے سرخ پھرن (۴) کے طلے اور آنچل پلّو کی تیز چمک کی کرنوں کو آگ کی طرح تیرگی میں اتارتے ہوئے انگلیاں مٹکائے، ٹھمکتے، تھرکتے:

''آن تے رے ناری نوم''

وہ گردش ماری کہ دیکھنے والے چکّر کھانے لگے اور کتنی کیسری پگڑیاں گرتے گرتے بچ گئیں۔اور جو چرخیوں میں آگ لگی تو عقل ہر پیر و جوان کی

---

(۱): وَن وُن: (کشمیری) وہ روایتی گیت جو کشمیری عورتیں خوشی بالخصوص شادی بیاہ کے موقعوں پر گاتی ہیں۔

(۲): تمبکناری: (کشمیری) ایک آلہ تال۔

(۳): وہ عورت جو تیرہ تالوں پر ناچ سکے۔

(۴) کشمیری: جبہ کے طرز کا ایک ڈھیلا لباس جو ٹخنوں کے نیچے تک لٹکتا ہے۔

چرخ میں آئی۔ پھر چٹ پٹ پٹاخے چھوٹے اور دھڑ دھڑاہٹ سے سارا علاقہ لرز اٹھا، باراتیوں کے کان جھنجھنائے۔ اور جب دلہن وداع ہوئی تو کتنی لمبی سفید ڈاڑھیاں بھیگ گئیں۔

اور ایک پٹاخہ ایسا چھوٹا کہ بارود کی چنگاریوں سے گھروں کے گھر جل گئے۔ بستیوں میں راکھ اڑنے لگی۔ گلیوں میں دن دھاڑے سورج ڈوبنے لگے اور طلے دار پھرنوں کی شفق رنگت ماند پڑ گئی اور لمبی سفید ڈاڑھیاں جوان خون کی چھینٹوں سے لال ہو گئیں۔

اور جس دن حویلی کی چار دیواری سے پہلی اینٹ اکھاڑ کر پھینکی گئی اُس دن دوپہر کو آسمان پر دھند چھا گئی اور پتہ نہیں کتنے پرندے گھروں کو لوٹتے ہوئے بے نام فضاؤں میں کہیں گم ہو گئے، اور مدّت سے دیوداروں کی شاخوں پر کریال کرتے بھوکے خونخوار گدھ اچانک لاوارث لاشوں کی بساند سے جاگ اٹھے اور برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی ڈھلوانوں میں جھنڈ کے جھنڈ منڈلانے لگے۔ اور جب اینٹیں گرتی رہیں تو رخنے بڑھنے لگے۔ پھر وہ دن بھی آیا جب فوجیوں نے حویلی میں عارضی کیمپ قائم کر کے رخنوں میں کانٹے دار تار کے بنڈل کھول کے باڑھ باندھی اور چار دیواری کے زخموں کو ترپال سے ڈھانک دیا۔

رخنوں کے اس پار حیرت زدہ بھیڑ میں کتنی لمبی سفید ڈاڑھیاں آج بھی بھیگ گئیں۔ کتنی آنکھیں حویلی کے نیم گرم ملبے کے نیچے دبے پڑے بیتے دنوں کی اشرفیوں کو کرید کرید کر نکالنے کی حسرت میں رو رہی ہیں۔ فائیر برگیڈ کو

کسی نے اطلاع نہیں دی، شاید کسی نے دی ہو اور پھر فرق بھی کیا پڑتا۔ چولھے کی آگ بھڑکی ہو تو جلی بھنی روٹی کو اتار کر توے پر پانی کا چھینٹا مارنے سے صرف چھناک سے ہاتھوں کو جھلسانے والی بھبک اٹھتی ہے۔

جس حویلی سے کبھی معصوم بچپن کے کھلکھلانے کی سرگم سنائی دیتی تھی پھر اسی سے چھدرا کے چلنے والے اسیروں کو بیڑیوں میں باندھ کر رفع حاجت کے لئے ہانکنے والے سپاہیوں کی کڑوی کسیلی گالیاں اور رولروں کے نیچے کچلے جانے والے معصوموں کی دلدوز صدائیں آنے لگیں۔ بیڑیوں کا ہیبت ناک غل اور دردناک چیخیں سن کر بچے اپنی ماؤں کی چھاتیاں چوسنا بھول جاتے۔ ہر رات قیامت کی طرح جب گزر جاتی تو چار دیواری کے اِس طرف خون میں بھیگے ہوئے کپڑوں کو گلی کے کتے سونگھ سونگھ کر پھاڑنے لگتے۔

اور جب صحن سے جوان گبرو کا ڈولا اٹھتا تو ٹوٹی بے حس باہوں سے دو اجنبی کاندھوں کا سہارا لینے والے باپ کی لمبی سفید ڈاڑھی بھیگ جاتی۔ لا الہ الا اللہ بڑبڑاتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے ڈولے کا کنارہ پکڑ کر لڑکھڑانے والے بزرگوں کے شانوں پر ساری کائنات کا بوجھ آن پڑتا۔ بہن کفن ہٹا کر دولہے کی مہندی لگی چھنگلیا کو پیپڑیلے ہونٹوں سے چومتی اور دھاڑیں مارتی پچھاڑیں کھاتی بیبیاں وہ رقص کرتیں کہ دھرتی چکرانے لگتی اور عرش پر فرشتے اپنے عمامے کس کر پکڑ لیتے۔

OOOO
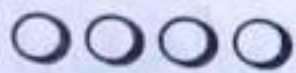
باب دُوم

"بی بی سی لندن"

بی بی سی لندن کی ساری نشریات ختم ہو چکی تھیں یا ہوا نے ریڈیائی لہروں کے ڈولتے سفینے کی سمت بدل دی تھی۔ آدھی رات کو قریبی فریکیونسی والے کسی گمنام اسٹیشن سے کوئی ٹمٹماتا ہوا حزنیہ گیت بج رہا تھا جیسے کسی انجان وحشی قبیلے کی کوئی بروگن الاؤ کے سامنے بال کھولے اپنے کھوئے ہوئے بالم کی یاد میں بروا(۱) گا رہی تھی۔ عجیب کسک بھری آواز، جس میں آگ کی تپش کے ساتھ کالی چکنی باہوں سے بہتے ہوئے پسینے کی جنگلی خوشبو بھی تھی۔ ہر لہرے میں مست جوانی کی تھکن کے بول۔ کبھی ڈھول کی لے درت ہو جاتی تو لگتا کہ دور کسی اداس ساحل پر ہوا ناریل کے پتّوں سے مجیرے بجا رہی ہے۔ اور ڈوبتی آنکھیں دور دیس سے آنے والے جہازوں کی جھلمل جھلمل کرتی روشنیوں کو دیکھ کر کبھی نہ لوٹ کے آنے والے مچھیروں کی راہ تکتے تکتے لہروں پر تھرکتی چاندنی سے شکوہ کر رہی ہیں۔

---

(۱): ایک راگنی جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اسے سن کر وحشی جانور بھی رام ہو جاتے ہیں۔

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ صدر دروازے پر دھڑ دھڑاہٹ ہو رہی تھی۔

''اتنی رات کو کون ہو سکتا ہے؟''

اسے یاد آیا کہ اس کی بیگم اس وقت سو گئی تھی جب وہ نیند کے خمار سے بوجھل آنکھیں موند کر بی بی سی لندن کی اردو نشریات سن رہا تھا:

''آج شہر کے پائیں علاقے میں ایک شخص کو نامعلوم بندوق برداروں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ بتایا جاتا ہے اس شخص پر پولیس کے مخبر ہونے کا الزام تھا......... یہ بی بی سی لندن ہے اور آپ.........''

ہمّت کر کے وہ پلنگ سے اٹھا۔ ہلکی سی چرمراہٹ سے چونک کر خود کو سنبھالا۔ کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر دیکھا۔ کمرے میں کھڑکی کے شیشے سے چاندنی چھن کر آئی تو بید کی شاخوں کے سائے فرش پر سانپ کی طرح لہرانے لگے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ گلی میں کتّے بھونک رہے تھے اور کوئی آہنی گیٹ کو مسلسل دھم دھما رہا تھا۔ خواجہ احمد قدوس کا ماتھا کھڑکی کے شیشے کو چھو گیا۔ اچانک ماتھے پر ٹھنڈک کے احساس نے انہیں چونکا دیا:

''بیگم!......... زینت!''

خواجہ نے بیگم کے شانوں کو جھنجوڑنا شروع کیا۔ زینت بیگم جاگ گئیں، گھبرا کر پوچھا:

''کیا ہوا؟''

خواجہ نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ بیگم کے منہ پر رکھا اور سرگوشی میں کہا:

''چپ چاپ بیٹھو........ گیٹ پر کوئی ہے۔''

یہ سن کر زینت کا دم فنا ہوا:

''مولا پت رکھنا........ گھر میں جوان بیٹی ہے۔''

اور جب کچھ دیر کے بعد طوفان تھم گیا، قدموں کی ہولناک چاپ ڈوب گئی .... دھڑکنوں کی رفتار ہموار ہوئی تو میاں بیوی نے اطمینان کا سانس لیا۔ خواجہ احمد قدوس نے آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور پلنگ پر دراز ہو گئے۔ کچھ دیر بعد کتوں نے بھونکنا بند کیا۔ کئی راتوں کی جگار سے چُور خواجہ خرّاٹے لینے لگے مگر زینت بیگم جاگ رہی تھیں کیوں کہ گلی میں خوف جاگ رہا تھا..... اور گھر میں جوان کنواری بیٹی سو رہی تھی۔ پھر زینت بیگم کھلی آنکھوں سے ساری رات ایک خواب دیکھنے لگیں۔ وہ گیلے کپڑوں میں بدن کی جھلکیاں چوری ہونے سے بچا رہی ہیں۔

صبح ہوئی تو زینت بیگم نے نائیلہ کے کمرے کا دروازہ کھولا، فرش سے لحاف اٹھا کر اپنی جوان کنواری بیٹی کا جسم ڈھانپ دیا۔

وقت جیسے ایک ہی جست میں کئی قرنوں کو پھلانگ کر کسی ان دیکھے انجانے نکتے پر آ کر تھم گیا اور ایسی آفت پڑی کہ آدھی رات کو اپنے دروازے پر دستک سن کر خواجہ احمد قدوس سوکھے پتّے کی طرح لرزنے لگے۔ ہوا یوں کہ جس دن پولیس تھانہ کے اہلکاروں نے ٹیلی فون کو ڈیڈ کر دیا اسی دن خواجہ نے اپنے صدر دروازے کی ڈور بیل ناکارہ بنا دی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے پرانے خدمتگار حبیب اللہ کا چہرہ اچانک جھرّیانے لگا۔ کنپٹیوں کے بال سفید

ہونے لگے۔ آنکھوں کے حلقوں میں سیاہی پھیلنے لگی اور چوکیدار مقبول خان کی نیند اچانک غائب ہوگئی اور وہ رات کو حقہ گڑگڑا کر اپنے زخموں کو سلانے کی کوشش کررہا ہے۔ کیونکہ حبیب اللہ کی دستار تین جوان بیٹیوں کے بوجھ سے ڈھلک کر شانوں پر آگئی اور مقبول خان کی لاٹھی کو دیمک لگ گئی۔

صبح ناشتے کے بعد باسی اخبار پڑھتے پڑھتے خواجہ نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ ان کے ہاتھ میں کئی دن کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی کانٹے کی طرح چبھنے لگی۔ وہ بڑبڑانے لگے:

''نخرے تو دیکھو اس نائی کے۔ کیسے حیلے حوالے کررہا ہے
واہیات شخص........ آنے دو آج پوری خبر لوں گا''

مس فائر

پورے ایک ہفتے کی ہڑتالوں اور کرفیو کے بعد رمضان حجام کی دکان کھلی تھی۔ گاہکوں سے اٹا اٹ بھری دکان میں مقبول خان داخل ہوا تو رمضان نے داہنے ہاتھ کی آنٹ سے صابن کا جھاگ استرے سے اٹھا کر کاغذ پر منتقل کرکے مقبول خان سے مسکرا کر پوچھا:

''کیوں خان! خیریت؟ خواجہ صاحب کیسے ہیں؟''

لکڑی کے گھسے ہوئے تختے پر کولہے سے کولہا ملا کر آٹم پاٹم بیٹھے لوگوں کو دیکھ کر خان کا چہرہ تمتما اٹھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اس بھیڑ میں کثرت ان کی ہے جو محض رمضان کی لچھے دار باتیں سننے بیٹھے ہیں۔ رمضان نے خان کے تیور

دیکھ کر جھٹ سے کونے میں پڑی ہوئی تپائی سے پرانے زمانے کا سرخمیدہ پنکھا اٹھا کر اسے ٹانڈ پر اوندھے منہ لٹا دیا اور مقبول خان تپائی پر بیٹھ گیا۔ ہجوم پر اس کی آمد ناگوار گزری کیوں کہ اس کے آنے سے قصّے میں بادھا پڑ گئی:

''تو جناب قصہ یوں ہوا۔''

رمضان نے حقہ مقبول کی طرف سرکاتے ہوئے قصہ جاری رکھا:

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ.........''

اس کی قینچی گاہک کے بالوں میں کچ کچ کوندنے لگی۔

''سوموار کی بات ہے ہماری طرف مکمّل ہڑتال تھی۔ صبح زوجہ گھبرا کر بولی سنو جی! رات کو ڈراؤنا سپنا آیا، میں تہری (۱) پکاتی ہوں تم سیّد صاحب کے آستان پر بانٹ کے آؤ، آتی بلا ٹل جائے گی۔ تو جناب والا، خدا سب کا بھلا کرے، کیا کہتے ہیں اس کو، بارہ بجے کا عمل تھا کہ میں سیّد صاحب کے آستان کی مراد والی کھڑکی سے تہری بانٹ کے جو دو رکعت نفل نماز کی نیت باندھنے لگا کہ یکا یک بھڑ بھڑ فائر ہوئے۔ دھماکے سے آستان کے صحن میں دانہ دنکا چگنے والے کبوتر یک مشت بھرّ امار کے اڑ گئے۔ میں جل تُو جلال تُو، صاحبِ کمال تُو، آتی بلا کو ٹال تُو کہہ کے جو گلی میں آیا، کیا دیکھتا ہوں آدم نہ آدم زاد بندہ نہ بندہ نواز۔ ایک راہگیر نے ڈرتے ہوئے بتایا کہ ''وہ'' آ گئے ہیں۔ رحم خدایا! جو ادھر معرکہ ہوا تو نہ جانے کتنے بے قصوروں کو گھروں سے

---

(۱): پیلے چاول جو نذر و نیاز کے طور پر بانٹتے ہیں۔ تاہری۔

نکال کر گلی میں گولیوں سے بھون ڈالا جائے گا، کتنے بسے بسائے گھر پھونک دئے جائیں گے۔ خیریت گزری کہ ادھر سے آئے ادھر گئے میرے اندازے سے کسی سے مس فائر ہوا تھا۔

''وہ'' ابھی نکڑ پر ہی تھے کہ ''یہ'' آگئے۔ لو جی! اب نئی مصیبت۔ اب انہوں نے جو پوچھا کہ کون تھے کہاں سے آئے تھے؟ کہاں گئے؟ کیوں آئے تھے؟ تو خیر میں کھڑکی کے شیشے سے دیکھنے لگا۔ ایک نامراد وردی پوش میرے گھر کے پھاٹک پر آکر اکڑ گیا۔ لگا دیوار سے اچک اچک کے صحن میں تاکنے .... میں گھبرایا کہ شاید گھر پھاند کر آدھمکے گا مفت میں خون خرابہ ہوگا۔ میں ٹھہرا خاندانی نائی۔ استرا تو سوتے میں بھی ساتھ رکھتا ہوں۔ چنانچہ جیب سے نکالا۔ ہتھیلی پر زور زور سے پٹک کر تان لیا۔ شمشیر برہنہ کی طرح۔ دل میں ٹھان لی کہ جو یہ ستیاناسی اندر گھس گیا اور مستورات سے ٹیس ٹی تو جست مار کے وہ وار کروں گا وہ وار کروں گا کہ ایک آن میں نرخرے سے استرا پار کر کے گردن یوں بھٹا سا اڑا دوں گا(۱) کہ جنم جلے کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا؟ جان کی کس کو پروا۔ جان تو صدقہ ہے عزّت کا۔ وہ تو کہیئے کہ منحوس کا دانہ پانی ابھی باقی تھا کہ وہاں سے فی الفور ہٹ گیا۔''

یہ سنکر گاہک نے چادر سے جو اس کی گردن کے نیچے لپٹی تھی ہاتھ نکالا کان کھجا کر حیرت سے پوچھا:

---

(۱): بھٹا سا اڑانا: ایک ہی ضرب میں چیز کا کاٹنا۔

''مگر رمضے! یہ تو بتا کہ ''وہ'' کون تھے اور ''یہ'' کون؟''۔

رمضان نے مسکرا کر جواب دیا:

''میر صاحب! دکان میں سیاسی گفتگو کرنا منع ہے......... میں غریب بار بر ہوں، کیوں مجھے پھنسا رہے ہیں۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

پھر وہ مقبول کی طرف مخاطب ہوا:

''مقبول خان! خواجہ صاحب سے کہنا کہ گاہکوں کے چہروں پر جنگل اگ آئے ہیں......... کاریگر کریک ڈاؤن (ا) میں پکڑا گیا ہے، اکیلا آدمی ہوں، اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی۔''

اس نے چادر جھٹک دی:

''ذرا سا بھیڑ کو نپٹا کر شام سے پہلے دکان میں تالا ڈال کر آجاؤں گا......... ضرور۔''

تین دن کے بعد جو رمضان آیا تو حبیب اللہ نے گیٹ پر ہی بتا دیا کہ

(ا): ایک قسم کا ملٹری آپریشن جس میں کسی بستی کو محاصرے میں لے کر خانہ تلاشی لی جاتی ہے۔ بستی کے مکینوں کو کسی جگہ جمع کیا جاتا ہے۔ جب تک فوج کو ملیٹنسی میں ملوث افراد کی شناخت کے لئے مخبر یا ''cats'' مہیا نہیں تھے، محض قیاس کی بنا پر لوگوں کو اٹھا کر تعذیب خانوں کی نذر کیا جاتا تھا۔ نوّیں کی دہائی میں کریک ڈاؤن کے تصور سے ہی کشمیریوں کی بوٹی بوٹی کانپتی تھی۔

خواجہ حاحب اپنی فیملی کے ساتھ کسی رشتہ دار کی عیادت کے لئے گئے ہیں، لہٰذہ وہ سیدھے سرونٹ کوارٹر پر گیا۔ مقبول خان حقے سے اس کی تواضع کرنے لگا۔ اس کی ڈاڑھی حد سے بڑھ کر بے ترتیب ہوگئی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ رمضان اس کی اصلاح کرے۔ رمضان نے مقبول کی ہیّت دیکھ کر ہی اس کی نیّت بھانپ لی۔ اس نے خوب جی بھر کے حقہ پیا اور کسبت کھول کر مقبول کو سامنے بٹھا کر قینچی اور کنگا اٹھائے۔ قینچی رپ رپ چلنے لگی۔ مقبول نے اس خوف سے کہ کوئی تراشا ہوا بال اڑ کے آنکھوں میں نہ چلا جائے، پلکیں موند لیں۔

ادھر رمضان بولے جا رہا تھا:

''کیا مقبول! تم خان ہو کر بال گھنے کے ڈر سے آنکھیں موند کے بیٹھ گئے۔''

مقبول نے ایک آن کے لئے آنکھیں کھول دیں:

''یار رمضے! تم باتوں کا جھاڑ لگا دیتے ہو۔ اگلے کو بولنے نہیں دیتے۔ مگر ایک بات ماننی پڑے گی، باتوں کے دھنی ہو۔ لہجہ البتہ شہر کا نہیں''۔

رمضان نے کچھ تامّل کیا۔ قینچی کو کنگھے سے ٹھونک کر مسکرایا:

''خان! اتنے برس سرینگر میں رہنے کے باوجود تمہارے لہجے سے چٹانوں سے ٹکرا کر آنے والی للکار کی بازگشت کا اثر گیا کیا؟...... چھپکے سے گرتے ہوئے آبشار کی گرج گھمر گھمر چلنے والی چکّی کی گھڑگھڑاہٹ

۔دھونٹی ہاتھ میں لئے مویشیوں کو ہانکنے والا چٹکارا۔ یہ سب گیا کیا؟ بول یارا!
مٹّی کا اثر خون میں ہوتا ہے اور خون کی رفتار لہجہ تراشتی ہے۔ میں اُس پیڑ کا
دَبّا(ا) ہوں جس کی جڑیں سوپور کی زمین میں پیوست ہیں۔ سوپور میں حجاموں
کا الگ محلّہ ہوا کرتا تھا۔ جہلم کے کنارے پر۔ وہیں ہمارا گھر تھا گھر کیا جھونپڑا
سمجھو۔ بہت کے حجام تو مفلس ہی ہوتے تھے۔ بڑی سختی کے دن دیکھے ہم
نے۔ بابا کے تین برادر تھے۔ شادیاں ہوگئیں تو سب الگ ہو گئے۔ بابا بھی
الگ ہو گئے تو صحن میں ایک اور جھونپڑا بن گیا۔ ہائے کیا بتاؤں کیسی مفلسی تھی
وہ کہتے ہیں نا کہ آگے ہاتھ پیچھے پات بس وہی صورت سمجھو۔ ایک ہی
کمرے میں پکانا، کھانا، سونا، عیادت، مہمانداری سب کچھ ایک چھوٹا سا موکھلا
تھا جس سے ذرا سی روشنی آتی تھی۔

ایک لمحے کے لئے رمضان رکا۔ اس نے گڑھے سے کٹوری میں پانی بھر
کے مقبول خان کے گالوں کے بالوں کو انگلیوں کی رگڑ سے نرم کرنا شروع کیا:
''یارا! غریبی اجگر ہے۔ رفتہ رفتہ کنڈلی کس کر کھیل ختم کر دیتی
ہے۔ میری ایک بہن تھی۔ کلثوم، مجھ سے عمر میں چھوٹی۔ اس کا چہرہ گلِ انار کی
طرح دمکتا تھا۔ ہم اسے لاڈ سے لالی کہتے تھے۔ نو برس کی تھی کہ دمّہ
ہوگیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ دھویں، گرد اور ٹھنڈ سے بچا کے رکھو۔ امّاں نے پرانی

(ا): درخت کی شاخ جس کو مٹّی میں دبا دیتے ہیں تا کہ جڑیں نکال کر نیا پودا بن
جائے۔

رضائی سے روئی نکال کراس کے سینے س پر رکھ دی۔ جب ننھی سی جان پر دمے کا دورہ پڑتا اور وہ ہانپنے لگتی تو مجھے لگتا کہ کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔ مجھ سے بابا اور اماں کا اضطراب نہ دیکھا جاتا۔ اماں پھٹ سے تیلڑی میں پلی ڈال کر تیل نکالتیں اور کانگڑی پر گرم کی ہوئی ہتھیلی سے اس کے سینے پر مالش کرتیں۔

اُس دن اماں کی آنکھ سویرے سے ہی پھڑک رہی تھی۔ انھوں نے چٹائی سے گھاس کا تنکا نکال کر آنکھ پر رکھا۔ تین دن سے لگاتار برف گر رہی تھی۔ اُس پر ایسی سردی کہ ہڈیوں میں گودا جم جائے۔ بابا دن میں کئی بار چھت پر چڑھ کر بھدا کے سے برف گراتے۔ میں چھت کے برنگے (۱) پر بیٹھ کر ان کو دیکھتا۔ ایک دفعہ رات کو برف کے بوجھ سے چھت کی کڑی جھک گئی۔ چرمراہٹ ہونے لگی تو بابا فوراً چھت پر چڑھ گئے اور بھد بھد بھدا بھد برف گرانے لگے۔ میں رات کو اندھا دیا (۲) لیکر حاجت کے لئے باہر نکلا۔ دھندلی روشنی میں چھت سے لٹکتی یخ کی قلمیں دیکھ کر مجھے لگا کہ کسی ڈائن نے چھت پر بیٹھ کر اپنے پنجے پھیلائے ہیں۔ مجھے پھریری آئی اور میں جھٹ سے اندر آیا۔ تین راتوں کی جگار نے ہمیں بے حال کر دیا تھا۔ بہن بری طرح ہانپ رہی تھی۔ پسلیاں پھڑک رہی تھیں۔ سینے میں جیسے دھونکی چل رہی تھی .... پچھلی رات کو ہم سب سو گئے۔

---

(۱) لکڑی کا تختہ جو چھت پاٹنے کے کام آتا ہے۔

(۲) دھندلی روشنی والا چراغ۔

بابا ترڑکے ٹین کا کنستر لیکر دریا سے پانی لینے گئے۔ امّاں نے جب لالی کے چہرے سے رضائی ہٹائی۔ ان کے منہ سے دردناک چیخ نکلی۔ میں جاگ گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ امّاں نے لالی کو گود میں لیا ہے اور وہ اس کے زرد چہرے کو بے تحاشا چوم رہی ہیں۔ بہن کا جسم اکڑ گیا تھا۔ بابا نے دور ہی سے شوروغوغا سن کر بھانپ لیا کہ گھر میں افتاد پڑی ہے کنستر وہیں چھوڑ کر برف پر بھدربھدر دوڑتے آئے۔ چنانچہ اسی کنستر کو چولھے پر رکھا گیا۔ اُسی پانی سے لالی کو غسل دیا گیا۔ اور جب بہن کی ڈولی اٹھی تو امّاں نے دھاڑتے ہوئے اپنے سر کو پیٹنا شروع کیا۔ میں نے امّاں کے ہاتھ کس کر پکڑ لئے ....

اور وہ بے ہوش ہوگئیں۔ کلثوم کی جیب سے کچھ سیپیاں اور ایک کتل (۱) نکلی .... اب بھی میرے پاس ہے''۔

اس نے مقبول کا چہرہ انگوچھے سے پونچھ کر کھڑکی کھولی اور چادر جھٹک کر آستین سے آنسو پونچھے:

''پھر؟'' مقبول کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

''پھر کیا؟'' رمضان حجام بولا:

امّاں اس صدمے سے نڈھال ہوگئیں۔ رنج وغم نے ان کے چہرے پر جھرّیوں کی بُوٹی بنائی۔ بہار آئی، بید کی شاخوں پر ننھے منے پات سرسرانے لگے تو بابا آسنی لیکر، گلے میں کسبت ڈال کر پھر سے نکلے .... اُن کی

---

(۱) ٹھیکری جس سے بچّے ایک کھیل ''لنگڑی'' کھیلتے ہیں۔

ٹخرٹخر چال (۱) دیکھ کر مجھے رونا آیا۔ کہتے ہیں بھوک جنم کی ہوک........"

رمضان نے ایک لمبی آہ بھر لی اور کہنے لگا:

کبھی کبھی امّاں سر پر قصابہ ڈال کر حکیموں کے یہاں چاول پچھوڑنے جاتیں اور شام کو کول برابر (۲) کنکی ہانڈی میں پکتے۔ مجھے بھوک لگتی تو امّاں پیار سے پیچ پلاتیں۔ بہت پیار کرتی تھیں مجھ سے۔ کبھی ڈوئی اور سنٹی سے کیا پال سے بھی نہیں مارا۔ ایک دن سکول سے آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ امّاں خون تھوک رہی ہیں۔ بابا پرانے اڈے کے پاس قبرستان کے بوڑھے چنار تلے دن بھر ڈاڑھی بڑھوں کی ٹوہ میں رہتے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تپ دق ہوگیا ہے، شہر لے جاؤ۔ شاید بس کرایہ کے لئے گرہ میں پیسے نہیں تھے۔ اس دن امّاں کو بستر پر لٹا کر بابا نے پگڑی اتار دی اور چولھا سلگایا۔ میری پڑھائی چھوٹ گئی اور میں رفتہ رفتہ خاندانی کسب سیکھنے لگا۔ بابا نے مجھے خوب اچھی طرح سلّی پر گھس گھسا کر، چموٹے پر پٹک پٹک کر استرے کی دھار بنانے سے لیکر بچّی، دھگ دھگی اور ہنسلی تک کے بال مونڈنے کی تربیت دی۔ ان دنوں ٹھیکیں (۳) پر دھاگا لگا کر غٹرغوں غٹرغوں بغبغاتے کبوتروں کی طرح گردن ہلا ہلا کر رندہ نہیں مارا جاتا تھا۔ نائی الٹا استرا پھیر کر رخساروں کو یوں

---

(۱) مری ہوئی چال۔

(۲) اناج کی وہ مقدار جو چکّی میں پیسنے کے لئے ڈالتے ہیں۔

(۳) رخساروں کے وہ بال جو مونچھوں سے مل جاتے ہیں۔

چکنا بنا تا تھا کہ گاہک کا ہاتھ اور دیکھنے والوں کی نظر پھسلتی''۔

یہ کہتے ہوئے رمضان کی آنکھوں میں عجیب چمک پیدا ہو گئی۔ بولا:

''خدا مغفرت کرے بابا اپنے فن میں استاد تھے، ہتھیلی کی رگڑ سے ڈاڑھی اس انداز سے نرم کرتے کہ استرا پھیرتے وقت گاہک کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ چہرے پر کوئی سرگرمی چل رہی ہے۔ اپنی استخوانی انگلیوں سے تیل لگا کر سر میں یوں مالش کرتے کہ سرور سے گاہک کی آنکھ لگ جاتی۔ کسی کسی کا تو اونگھ سے سر لڑھک کر بابا کے سینے پر آ جاتا۔ کبھی چوک سے گاہک کے منہ پر چرکا لگتا تو صابن کے جھاگ میں چھپا کر اس پر اس طور سے پھٹکری پھیرتے کہ چرکے کا کوئی کھرکھوج نہیں رہتا۔ البتہ سوپ سی ڈاڑھی تراشنے میں مشکل ہوتی تھی۔''

سترِ عورت

''اکتا تو نہیں گئے؟''

رمضان نے دم لے کر مقبول سے پوچھا۔ مقبول نے نفی میں سر ہلایا۔ رمضان نے قصے کو آگے بڑھایا:

''یار خان! اماں کو میں نے پل پل مرتے دیکھا ہے۔ جس دن اماں نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں اس دن میں بہت رویا۔ البتہ بابا نے کلثوم کی وفات پر جھڑی لگا کر آنکھوں کو صدا کے لئے کال بنجر بنا دیا تھا۔ اماں کے گزرنے سے سارا گھر غتر بود ہو گیا میرا ننہال تو سرینگر میں تھا دوسرے دن ماما کو خبر ہوئی۔ نانی، ممانی، ماما اور یاد نہیں کون کون آ گئے۔ چوتھا ہو چکا تو رات

کوکسی بات پر ماما اور بابا میں تکرار ہوئی۔ بابا اکثر غصے میں ہلاس دانی نکالتے اور نسوار کے ساتھ غصّہ بھی تھوک دیتے مگر اس دن ہلاس دانی نہیں نکلی۔ شاید امّاں کہیں رکھ کر بھول گئی تھیں۔ خدا جانے کیا گتھی پڑگئی کہ ماما نے بابا کے منہ پر وہ زوردار چانٹا مارا کہ ان کی پگڑی گر کے فرش پر کھل گئی۔ مجھے بابا پر ترس اور ماما پر بہت غصّہ آیا۔ صبح سویرے سب لوگ چلے گئے۔ اگلے روز بابا معمول کی طرح کسبت گلے میں ڈال کے چلے گئے۔ میں ان دنوں چوک میں صمد ٹاکی کے پاس والے فٹ پاتھ پر بیٹھتا تھا۔ اس زمانے میں سوپور میں حجاموں کی کچھ ہی دکانیں ہوا کرتی تھیں جن میں صرف رئیس روٴسا اور بڑے افسر حجامت کے لئے آتے۔

ایک دن کسی حریت پسند کی جیل میں موت ہوئی۔ خبر پھیلی تو بازار آن کی آن میں بند ہوگیا۔ پولیس نے پہلے لاٹھی چارج کیا۔ جب احتجاجیوں کا طیش کم نہ ہوا تو فائر جھونک دئے۔ بھگدڑ مچ گئی تو جان بچانے کی خاطر بابا محلّہ خواجہ گلگت کی طرف بھاگے۔ وہاں بساہندے پانی کا ایک جوہڑ تھا جس میں گلے سڑے جانوروں کے ماس پر پلنے والے کیڑے تیرتے رہتے تھے۔ بابا نے ایک مکان میں پناہ لی جس میں صرف مستورات تھیں۔ چونکہ مکان سرِراہ تھا اس لئے مرد پولیس والوں کے ڈر سے بھاگ گئے تھے۔ پولیس کے اہلکاروں نے پتھراوٴ کرنے والوں کے خلاف جوہڑ کے ایک طرف مورچہ بندی کی۔ غفلت میں جو بدنصیب راہگیر وہاں سے گزرتا اسے دبوچ کر زبردستی تالاب میں ڈبکی لگانے پر مجبور کرتے پھر اچھی طرح پیٹ کر چھوڑ

دیتے۔ایک مُعمّر مسافر نے جب ضد کی تو اس کے کپڑے پھاڑ کے اسے تالاب میں دھکیل دیا۔پھر ننگے تن پر ڈنڈے مار مار کے ہانکا دیا۔ایک دوشیزہ نے یہ ہیبت ناک منظر دیکھ کر اپنے سر سے اوڑھنی اتار کے بابا کی طرف پھینک دی:

''خدا کے لئے اس بیچارے کو ستر عورت دیکر آؤ''۔

بابا نے اوڑھنی لپک لی اور دوڑ پڑے۔پولیس والوں نے یلغار کی۔ بابا دوڑتے دوڑتے گر گئے۔ظالموں نے انہیں آن لیا اور کپڑے اتارنے پر مجبور کرنے لگے۔بابا زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔مستورات نے البتہ دھاوا بول کر بابا کو چھڑا دیا۔میں یہ پتا سن کر بہت دنوں تک رویا۔کس جرم میں اس لاچار بزرگ کی اسقدر بے حرمتی کی؟؟؟

اس غدرِ صغیر کے بعد بابا کی طبیعت بگڑنے لگی۔جوڑوں میں درد ہونے لگا۔مرض بڑھ گیا تو انگلیوں،کلائیوں اور ٹخنوں کے جوڑ اپنی جگہ سے ہلنے لگے۔گھٹنے کی ہڈی بطخ کی چونچ کی طرح باہر نکل آئی۔میں نے بہت سمجھایا:''بابا!........ تمہارے ہاتھ اینٹھ گئے ہیں........انگلیاں لرز رہی ہیں،آنکھوں میں جھفتے پڑ گئے ہیں۔کسبت چھوڑ کر گھر میں آرام سے بیٹھو نائی کا استرا کوئی قصائی کا بغدا نہیں۔مگر سب فضول،ایک نہ مانی۔پھر وہی ہوا جس کا کھٹکا تھا۔جون کا امس بھرا دن تھا۔تڑاقے کی دھوپ،ٹاکی کے آگے کلفی والے کی ہانک میری پیاس بڑھا رہی تھی۔ایک دفعہ چونی لیکر کلفی لینے گیا کہ بابا کی مسکین صورت آنکھوں میں پھر گئی۔اتفاق دیکھو کہ اسی وقت ایک ریڑھ

سامنے آکر رکا۔ کسی نے آواز لگائی:

''رمضے! ادھر آ ذرا''۔

میں نے دور سے دیکھا بابا کی پھٹی جوتی چادر سے باہر تھی۔ ریڑے پر ان کی میت ان کی ہی پگڑی میں لپٹی تھی۔ میں نے ماتھا پیٹتے ہوئے پوچھا:

''کیا ہوا میرے بابا کو.........؟''

کسی نے کہہ دیا کہ گھمس میں للکارتے کسی کے منہ پر برش سے جھاگ پھینٹ رہے تھے کہ اچانک گر کے ڈھیر ہوئے۔ میں نے پردہ اٹھا کر دیکھا بابا کا منہ غار کی طرح کھلا تھا۔ بھوک جنم کی ہوک......... مجھے یاد آیا جب میں پہلی بار کسب کرنے نکلا تھا اماں نے کانگڑی میں ''پڑھا ہوا'' سپند جلا کر مجھے ہونس سے بچانے کے لئے دھونی دی تھی۔

چوتھا ہو چکا تو پانچویں دن ماما نے چھپری پر تالا چڑھا کر میری کلائی پکڑ لی اور بس میں بٹھا کر سرینگر لے آئے......... اسی شام مولوی کو بلا کر اپنی کیا کہتے ہیں اس کو اکلوتی بیٹی کے ساتھ میرا نکاح پڑھوایا۔ میرے دن پھر گئے۔ مکان، دکان، جورو سب خدا نے غیب کے خزانے سے بخشے۔ کہاں تو وہ سختی کا زمانہ کہ دن بھر بوری پر بیٹھ کر پاؤں سنسناتے تھے اور کہاں یہ دکان۔ سبحان تیری شان۔ حجامت کے لئے دو کرسیاں، کرسیوں پر سر ٹکانے کے لئے اوپر نیچے ہونے والا چوبی تکیہ۔ کہاں وہ ساڑھے چھ آنے کا آئینہ جس میں اپنی مسخ صورت دیکھ کر گاہک کو وحشت ہوتی تھی۔ کہاں فریم میں جڑا ہوا بڑا آئینہ جس میں گاہک پہروں چہرہ نہارتا جائے۔ ماما نے اپنے سر سے

بوجھ اتار کے دم لیا۔ البتہ شادی بیاہ کے علاوہ بچوں کے منڈن پر یا منت کی چٹیا مونڈنے جاتے تھے۔ الطاف ہونے کے تین مہینے بعد ماما خدا کو پیارے ہو گئے۔ پھر تین سال بعد ممانی سدھاریں۔ اسی سال نرگس پیدا ہوئی۔ خدا نے حساب برابر کر دیا۔ سبحان تیری شان......"

رمضان یہ بول ہی رہا تھا کہ حبیب اللہ نے دروازے کھول کے رمضان سے کہا:

"رمضے! خواجہ صاحب آ گئے۔"

رمضان کسبت میں سامان ڈالنے لگا:

"ٹھیک ہے حبیب اللہ! تم ان کی حجامت کا سامان نکال دو میں بس آیا۔"

یہ کہہ کر وہ مقبول خان سے مخاطب ہوا:

"ہاں تو بھائی! کہاں تھے ہم؟"

وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مقبول نے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو جوڑا:

"تم کہہ رہے تھے کہ نرگس پیدا ہوئی۔"

رمضان نے حقہ پکڑ کر کہا:

"ہاں۔ یار خان! سچ پوچھو تو جوانی میں نے دیکھی ہی نہیں۔ پچاس کے پیٹے میں ہوں۔ بچپن سے اب تک کا سفر مانو ننگے پاؤں انگاروں پر سے گزر کر طے کیا ہے۔ ایک دفعہ مولوی فضل اللہ سے پوچھا: "خدا کے دربار میں یہ تفاوت کیوں؟" بولے اس کی شانِ تقسیم پر سوال کرنا کفر ہے۔ مقبول خان!

ان گنہگار آنکھوں نے صرف امیروں کو امیر ہوتے دیکھا ہے۔خواجہ صاحب البتہ الگ بیخ نکالتے ہیں۔ کہتے ہیں غلامی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔غلامی غریبوں کو سر اٹھانے نہیں دیتی......... معلوم نہیں ہماری کتنی پشتیں لوگوں کی بغلیں لے لے کر مر کھپ گئیں ۔مرنے سے پہلے لال چوک میں الطاف احمد کا سیلون دیکھنا چاہتا ہوں۔مردوں اور لگائیوں کے لئے الگ الگ ۔جہاں امیر امراء بڑے افسر اور ان کی پھدکتی شہزادیاں بڑی بڑی موٹروں سے اتر کے ٹھسے سے حجامت کے لئے آئیں۔میں دنیا کے گورکھ دھندوں سے الگ ہو کے درگاہ شریف کی دہلیز سے چمٹ جاؤں۔خان! یہ بتاؤ بالفرض اگر ہم آزاد ہو گئے تو کیا غریبوں کے خواب بھی پورے ہونگے؟''۔

مقبول خان نے ہمدردی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں ہونا تو وہی چاہئے۔''

''شاباش''

رمضان نے نعرہ مار کر حقے کا نیچہ پکڑا،گال سے رگڑ کر منہنال صاف کی:

''تیرے منہ میں گھی اور شکر۔اور ہاں دیکھنا،زندہ رہا تو الطاف احمد کی شادی کسی رئیس خاندان میں کروں گا۔میری طرف سے آج ہی تم دعوت قبول کر لو۔مع اہل وعیال.........''

مقبول خان کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔جیسے کسی سوئے ہوئے زخم کا کھرنڈ چھل گیا اور دل میں زبردست ٹیس اٹھی۔خان نے ایک لمبی سرد آہ بھر

لی۔اوراس کی آہ ایک تلاطم خیز طوفان کی لہروں کے شور میں کھوگئی---خون کا ایک ایسا طوفان جس کی اچھلتی لہروں نے ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ کے ایک خونین باب جلیاں والا باغ کے پتے پر سرخ رنگ چھڑک کر اسے گیروا بنادیا۔

''اے ظالمو!اے غاصبو!! کشمیر ہمارا چھوڑ دو''۔

''نعرۂ تکبیر ....اللہ اکبر۔''

بازار چلو کی کال پر آس پاس کے دیہات سے لوگ سیلاب کی طرح امڈ پڑے۔حاجی عبدالجبار خان نے سفید رنگ کے خان ڈریس پر کالے رنگ کا واسکٹ پہنا۔اصغر خان نے الماری سے قرہ قلی ٹوپی نکال کر دادا کے سر پر سلیقے سے رکھ دی۔جلوس میں اتنے لوگ تھے کہ تھالی پھینکو تو زمین پر نہ گرے،اور پر جوش کفن برداروں کے نعروں سے زمین ہل رہی تھی۔اچانک سپاہیوں نے آگے سے جلوس کا راستہ روک کر یمین ویسار سے لوگوں کو گھیرے میں لے لیا اور بنا کسی تنبیہ کے پر امن احتجاجیوں کے نہتے سینوں پر بندوقوں کے دہانے کھول دئے اور بھاڑ سا بننے لگے۔چاروں طرف بھاگم بھاگ اور افراتفری مچ گئی۔چپے چپے پر لاشیں اور خون دیکھ کر لوگ بھونچکے رہ گئے۔اور کتنے اپنے عزیزوں کی ڈھنڈیا میں خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ایک گلی میں حاجی عبدالجبار خان کی نظر اپنے پوتے پر پڑی۔اصغر زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا۔دادا نے اسے چت لٹا دیا تو ان کے منہ سے دردناک چیخ نکلی۔اصغر کا پیٹ پھٹ گیا تھا اور اس کی آنتیں باہر آگئیں تھیں۔حاجی

خان نے پوتے کی اوجڑی واپس ٹھونس کر اپنے واسکٹ سے پیٹ کے چاک کو ڈھانک دیا.........اولاد کی محبّت نے اسقدر مجبور کر دیا کہ اپنی راجپوتانہ آن انا بھول گئے اور ایک سپاہی کے پاؤں پکڑ کر گڑگڑانے لگے:

''صاحب! صاحب جی! میرا پوتا مر رہا ہے کچھ کیجئے۔''

اس دبنگ نے ضعیف بزرگ کے سینے پر لات ماری۔ حاجی خان بے بس ہوکر زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ درشت نے اپنے غلیظ جوتے سے عبدالجبار خان کی لمبی سفید ڈاڑھی کو مسلنا شروع کیا۔ اس کے ساتھی نے کہا:

''میں تو کہتا ہوں ابھی سمے ہے نپٹا دو جنگلی سئور کو۔''

اور بندوق کے دہانے سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی، حاجی خان کی بنڈی میں بیس چھید تھے.........

کوئی نہیں جانتا کہ اصغر خان کس طرح بڑے ہسپتال پہنچا۔ مقبول کہتا ہے کہ خدا کی مخلوق۔ کوئی فرشتہ یا جنّات میں سے کوئی ہوگا جس نے میرے لال کو بچایا۔ جس وقت مقبول خواجہ صاحب کے ہمراہ ہسپتال پہنچا اصغر کو آپریشن تھیٹر سے باہر لایا جا رہا تھا ٹھیک اسی وقت اس کے بابا کا ڈولا مزارِ شہدا میں اتارا گیا۔ اصغر کی کمر میں ایک گولی پیوست ہوگئی، کمر کا دھاگا ٹوٹ گیا ۔جس کے گھر میں جوان معذور بیٹے کو ماں کھلاتی پلاتی ہو اور بڑا بھائی گوہ موت کراتا ہو بھلا اس کا دنیا کے شادیانوں سے کیا لینا دینا۔

مقبول خان پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا۔

○○○○

باب سوم

لاج ونتیاں

اور وہ جو تنبور کے تار کو ٹناتے (۱) ہوئے آنکھیں میچتے تھے.........وہ جو سہم سہم کے غباروں میں پھونک بھرتے تھے۔وہ جو غلیل کا کھچاؤ کم کر کے پرندوں پر کنکری پھینکتے تھے۔نیند میں پازیب کی جھنک جھنکار سے چونک کر اٹھتے تھے۔پٹاخوں کے جھماکوں سے جھنتاتے ہوئے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے تراہ تراہ کہہ کر گزرتے تھے۔شریر بچوں کو پھرن کی آستین سے مارتے تھے۔

......جب ایک موسم ایسا آیا کہ دھرتی کے سینے سے کونپلوں کے بجائے بارودی سرنگیں پھوٹنے لگیں تو بسے بسائے گھروں اور چہکتی مہکتی بستیوں کو سنسان کر کے قافلہ در قافلہ ہجرت پر روانہ ہو گئے اور جب پچھلی رات میں نکلا ہوا قافلہ جواہر ٹنل (۲) کے اُس پار بانہال پہنچا تو دھندلی روشنی میں شانوں پر

---

(۱) ٹنانا: کھنچنا۔ کسنا۔

(۲) وادیٔ کشمیر کو بھارت کے دوسرے خطوں سے ملانے والی ٹنل۔ یہ بانہال ٹنل کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ یہ ٹنل ۱۹۵۶ میں آمدورفت کے لئے کھولی گئی۔

ڈھلک کر آئی ہوئی کیسری پگڑیوں کو سنبھال کر انہوں نے آخری بار مڑ کر چندھیائی آنکھوں سے اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے پرکھوں کے تبرکات کو دیکھنا چاہا تو پیر پنچال نے اچانک کروٹ بدل کر انگڑائی لی اور ایک نئے اُفق کی لکیر کھینچ ڈالی......... ایک آن کے لئے انہیں لگا کہ اس افق کے آگے کوئی اور افق نہیں۔ جیسے دھرتی کا انت ایک ایسے پرکار سے کھینچے ہوئے قوس پر ہو گیا جس کے پنسل لگے بازو کو لقوہ مار گیا ہے۔

اور وہ آندھی میں بھٹکتے ہوئے پرندوں کی طرح بھونچکے رہ گئے۔

پھر جب تھکے ہارے کاروان ادھمپور اور جموں کے مہاجر کیمپوں میں اتر گئے تو سروں پر دھول سے اٹی ہوئی اوڑھنیاں سنبھالے اپنے چہروں کو آنکڑے بنانے والے سرکاری افسروں، فلاحی تنظیموں کے کارندوں اور اجنبی تماشائیوں سے چھپائے، ایڑیوں کے نیچے لٹکنے والے پھرنوں کے چوڑے دامن سمٹائے، اپنی چنریوں سے پھٹے ہوئے خیموں کے رخنوں کو ڈھانکنے والی لاجونتیوں کی بے بسی پر آکاش رویا اور ایک ماں ایسی تھی جو اپنی چنری اکلوتے لخت جگر کے سینے میں خون کا فوارہ اگلنے والے ہولناک درّے میں ٹھونس کر بھول گئی تھی جس کو کسی نے سڑک پر گولی مار دی اور ماں نے جب مدد کے لئے آنچل پسارا تو کتنی گاڑیاں سڑک سے دھول اٹھا کر چلی گئیں۔ اس مائی کے بالوں پر وقت نے مٹھیاں بھر بھر کے راکھ ڈال دی اور اس کے سارے وجود پر گندہ بہار میں گرنے والی ہلکی برف کی تہہ رنج و غم کی یخ بستہ ہواؤں سے ایسے جم گئی کہ ہڈیوں سے گودا نچوڑنے والی لُو بھی اسے پگھلا نہ سکی۔ اور پیر پنچال

کے اس طرف وادی میں کتنی مائیں ایسی تھیں جن کے کڑیل جوانوں کے سینوں میں بھل بھل خون اگلتے سوراخ اوڑھنیوں سے محروم رہ گئے۔

ماسٹر ترلوک ناتھ کول

اور جس روز محمد رمضان حجام کا اکلوتا لال الطاف احمد گھر سے دولہے کی طرح سرحد پار کرنے کے لئے رخصت ہوا اس روز آسمان پر تیسرے پہر کے بعد غضبناک بادل چھا گئے، اور آسمان سے تڑخ تڑخ پانی برسنے لگا۔ دیر تک گھنے تناور درختوں کو چکّی کے پاٹ کی طرح گھمانے والی ہوا کا بھنور جب نہ ٹھہرا تو خلقِ خدا خوفِ خدا سے لرزنے لگی، اور بزرگوں کو جب اندیشہ ہوا کہ شاید آسمانوں میں طوفان نوحؑ جیسی کسی بھیانک بربادی کا سامان تیار ہو رہا ہے تو قرآن مجید لرزتے ہاتھوں میں لے کر کھڑکیوں سے ہمک ہمک کر خدا کے حضور میں توبہ و استغفار اور گریہ و فریاد کرنے لگے۔

ماسٹر ترلوک ناتھ کول کی بہو بِبلی نے جب ترچھی بوچھاڑوں سے بچتے ہوئے دوسری منزل کی کھڑکیاں بند کیں تو ایک نظر سہمی ہوئی ان اجاڑ مکانوں پر ڈالی جن کی کھڑکیوں کے پٹ بے کسی میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ماسٹر ترلوک ناتھ کول رسوئی میں چوکی پر بیٹھے کمبل اوڑھے تمباکو پی رہے تھے۔ بِبلی مغلئی چائے کا گلاس لیکر آئی تو ماسٹر جی نے پھرن کی بائیں آستین ہتھیلی پر پھیلا کر گلاس لے لیا۔ بِبلی ایک لمبی آہ بھر کے جانے ہی والی تھی کہ ماسٹر جی نے روکا:

"سنو بیٹی! کئی دن سے دیکھ رہا ہوں سنیل کا مزاج کچھ چڑ چڑا ہو رہا

ہے اسے سمجھاؤ کہ ہر آن کی یہ جھڑ کا جھڑ کی ٹھیک نہیں تم لوگ اگر.........''

ببلی نے ماسٹر جی کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

''بابو جی! بھوک کی جانچ اور جگار کی جھنجھلاہٹ آدمی کو حیوان بنا دیتی ہے۔''

یہ گنجلک کی بات ماسٹر کی سمجھ میں نہیں آئی:

''آخر قصہ کیا ہے.........وستار سے بتاؤ۔''

ببلی کی آنکھیں نم ہو گئیں:

''بابو جی! جب رات کے گہرے سناٹے میں پتہ کھڑکتا ہے اور ہم خوف سے لرزنے لگتے ہیں۔ تو اپنے سب سے مضبوط سہاروں کو اس حال میں دیکھ کر منا بلبلانے لگتا ہے میں ڈرتی ہوں کہیں اس معصوم چونکیل کا دل پسلیوں کو پھلانگ کر باہر نہ آجائے۔''

ماسٹر نے تلچھٹ کے ساتھ آئی ہوئی چائے کی لمبی پتیوں کو پپول کر گلاس میں اگالتے ہوئے کہا:

''مگر بیٹی! پرندہ گھونسلے میں اور منش اپنے گھر میں سب سے زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔''

ببلی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

''بابو جی! جس مکان کے اندر بانبی ہو اس کے مکینوں کو نیند نہیں آتی وہ رضائی کی سرسراہٹ سے بھی چونک اٹھتے ہیں......... ہوا کے سنکنے کو سانپ کی پھنکار سمجھ کر کانپنے لگتے ہیں۔ آپ مان کیوں نہیں لیتے۔ بہت دیر ہو گئی

اب۔ ہمارے فرقے کے سب لوگ جا چکے ہیں پیچھے صرف ہم رہ گئے۔ سارا محلہ بھائیں بھائیں کر رہا ہے.........دن دہاڑے ہول آنے لگتا ہے۔"

ماسٹر نے پرانا خبار کھول کر کہا:

"میں نے کسی کو نہیں روکا....... سب اپنی مرضی کے مالک ہیں جس کا جب جی چاہے سدھارے میرے بارے میں کسی کو فکر مند ہونے ضرورت نہیں۔"

ماسٹر ترلوک ناتھ کا اکلوتا بیٹا سنیل دوسرے کمرے میں یہ سب گفتگو سن رہا تھا۔ اچانک وہ تاؤ میں آکر اپنی بیوی سے مخاطب ہوا:

"ببلی! کیوں پتھّر پر سر پٹک رہی ہو۔ یہ ہماری ارتھیوں کو کاندھا دیکر ہی یہاں سے نکلیں گے.........اور یاد رکھنا جن کی پرتیت (ا) پر یہ یہاں ٹکے ہوئے ہیں اگر انہوں نے ہی وشواس گھات نہ کیا تو میرے منہ پر تھوکنا۔ کیا میں نہیں جانتا کہ انھوں نے ممّی کو جموں کیوں بھیجا۔ وہ دکھیاری مہاجر کیمپ ہیں ہماری راہ تکتے تکتے باولی ہوگئی ہے کوئی جئے یا مرے ان کی بلا سے۔"

"چپ ہو جاؤ........."

ماسٹر چلانے لگے:

"اسے بہت شوق تھا میکے جانے کا......... تمہارے ماموں مارے

(ا) بھروسا۔ یقین۔

ڈر کے افراتفری میں اسے بھی ساتھ لیکر بھاگ گئے اس میں میرا کیا دوش ہے۔؟''

''مگر بابو جی! وہ میری ماں ہے۔ میں اپنی ماں کے آنچل سے جدا ہو کر چین سے نہیں رہ سکتا........''

سنیل روہانسا ہو گیا۔

ماسٹر جی نے یہ سن کر فرش پر ہاتھ پٹکا اور دھاڑتے ہوئے کہا:

''تو یہ دھرتی بھی میری ماں ہے۔ میں اپنی ماں کے آنچل سے کیسے جدا ہو سکتا ہوں۔ دھار دھار امرت پلانے والی وتستا (۱)۔ پات پات ہریالی بچھانے والی ندیاں۔ گود گود ممتا سے بیج سینک کر کونپل بنانے والی مٹی ....لہر لہر خوشبو کا آنچل لہرانے والے پھول۔ ڈال ڈال رس ٹپکانے والے پیڑ۔ یہ سب میری دھرتی کے وردھان ہیں۔ میں اپنی ماتا کے وردھان سے منہ موڑ کے نہیں جا سکتا........''

یہ سن کر سنیل آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ پر آ کر کہنے لگا:

''ماسٹر ترلوک ناتھ کول!...............اجی کس دھرتی کی بات کر رہے ہیں آپ؟ جس کے انگ انگ سے نرک کی لپٹیں اٹھ رہی ہیں۔ کس زمین کی بات کر رہے ہیں؟ جس کا سینہ گلی سڑی لاشوں کی بدبو سے ابس رہا ہے۔ کن پیڑوں کی بات کر رہے ہیں؟ جن کی شاخوں پر معصوم ابلاؤں کو لٹکا

---

(۱) دریائے جہلم کا قدیم نام۔

کر بے دردی سے پھانسی دی جارہی ہے۔کن پھولوں کی بات کررہے ہیں آپ؟........ جن کی جھاڑیوں کے سائے میں گولیوں کے زنگ آلودہ کھوکھوں(۱) کے ڈھیر جمع ہورہے ہیں۔کس وتستا کی بات کررہے ہیں؟جو خون کے دھاروں کا سنگم بن گئی ہے۔جس کے پانی میں بہتی ہوئی گلی سڑی لاشوں پر چیل کوّے ٹُنکارتے (۲)رہتے ہیں۔جس کے کناروں پر جب پھولی ہوئی لاشیں اتاری جاتی ہیں تو انھیں شناخت کرنے کیلیۓ واویلا کرتے ہوئے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں۔آپ بے چین آتما کی طرح ماضی کے کھنڈروں میں بھٹک رہے ہیں........ آپ کی برن مالا (۳) ٹوٹ کر بکھر گئی ہے اور اندھیرے میں ٹٹول کر موتیوں کی تلاش کا سفر آپ کو ایک گہری ڈراؤنی کھائی کے دہانے پر لا کر کھڑا کردے گا........ بابو جی! جس سونے سے کان ٹوٹیں اسے بھاڑ میں جھونکنا ہی بہتر ہے۔''

یہ سن کر ماسٹر تھرتھرانے لگے۔انہوں نے سامنے پڑا تمباکو کا ڈبہ اٹھا کے سنیل پر پھینکا۔ہاتھوں کی تھرتھراہٹ سے نشانہ چوک گیا۔ڈبا ایک خوف ناک آواز کے ساتھ دیوار سے ٹکرا کر گر گیا۔منّے کے منہ سے ڈراؤنی چیخ نکلی:

---

(۱) کھوکھا Empty Cartridge اصطلاح میں وہ خول جس میں بندوق کی گولی ہوتی ہے

(۲) ٹنکارنا: چونچ مارنا۔

(۳) حروف کا ہار۔

''پاپا جی!''

سنیل نے دوڑ کر بچّے کو گلے سے لگایا۔ ماسٹر جی کانپنے لگے تو بہو نے دوا کی ٹکیا نکال کر ان کی زبان کے نیچے رکھ دی:

''بابو جی!''

سنیل کی آواز سِسکی میں ڈوب گئی۔

جعفری پھولوں کی مالا

لائٹ دوپہر سے ہی غائب تھی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تو بارش تھم گئی، مگر وقفے وقفے سے بجلی کوندنے کے ساتھ ساتھ بادل گرجنے لگے۔ پھر ایک ہولناک گرج سے کھڑکیوں کے شیشے جھنجھنا اٹھے، لگا کہ دیواروں نے گھبرا کر جھر جھری لی۔ بجلی کی خوفناک کڑک سے ماسٹر ترلوک ناتھ کول کی آنکھ کھل گئی:

''کیا ہوا؟........ کیا کوئی دھماکا؟''

انھوں نے چونک کر ببلی سے پوچھا۔ دروازے پر دیر سے دستک ہو رہی تھی اور ببلی خوف کے مارے دم سادھ کے بیٹھی تھی۔ ماسٹر جی نے لالٹین اٹھا کر دروازہ کھولا۔ گلی میں کچھ لوگ بڑبڑا رہے تھے۔ ماسٹر جی چوکھٹ پر کھنکارتے ہوئے بولے:

''آؤ خواجہ اندر آجاؤ''۔

خواجہ اندر آئے تو ایک آن کے لئے انھیں لگا کہ جیسے وہ کسی صدیوں پرانے کھنڈر میں اچانک داخل ہوئے۔ لالٹین کی دھندلی روشنی میں اداس

دیوار پر شہادت کی انگلی سے لکھے ہوئے ''اوم'' کے بازو میں ترلوک ناتھ کے والد پرتھوی ناتھ کول کی تصویر جیسے انھوں نے پہلی بار دیکھی ہو۔ دھندلی اور پراسرار تصویر میں صرف پرتھوی ناتھ کی پگڑی صاف دکھائی دے رہی تھی ان کا کتابی چہرہ اور پھرن کے گریبان کا تکمہ دھند میں کہیں کھو گئے تھے۔ تصویر کے گرداگرد سوکھے جعفری پھولوں کی مالا دیکھ کر خواجہ کو لگا جیسے کالا ناگ کنڈلی مار کر دیوار پر بیٹھا پھنکار رہا ہے اور پرتھوی ناتھ کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا ہے۔ گھنے گہرے سناٹے سے خواجہ کو ہول آنے لگا انہوں نے کہا:

''ایسی آندھی نہ دیکھی ہے اور نہ سنی.........''

ترلوک ناتھ کی آواز دھندلی ہوگئی، بولے:

''ایک آندھی وہ تھی جس نے لاکھوں ہزاروں پیڑ جڑ سے اکھاڑ کر اِدھر اُدھر پھینک دیئے۔ کیسے گلابوں کے جھاڑ سوکھ کے کاٹھ ہوئے۔ کیسے بسے بسائے گھر کباڑ ہو گئے۔ آکاش سے خون کا میگھ برسا۔ ایک آندھی یہ ہے کہ خون کی چھینٹوں سے سرحد کے داغ دھونے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

خواجہ نے جھرجھری آواز میں کہا:

''اور اس بدنصیب سرزمین کی المناک داستان کا ایک باب تب لکھا گیا تھا اور ایک نیا خونریز باب اب لکھا جا رہا ہے۔ اور ۱۹۴۷ء میں جشنِ آزادی پر دیوانہ وار رقص کرنے والے سرمستی میں یہ بات بھول گئے کہ جس ڈھول کی تھاپ پر وہ تھرک تھرک کر ناچ رہے ہیں اس پر کشمیری قوم کی کھال

بڑی مہارت سے منڈھی گئی ہے۔"

ماسٹر جی آستین سے آنسو پونچھنے لگے:

"......اور ایک آندھی آج یہاں آئی اور ماسٹر ترلوک ناتھ کول بھول گیا کہ جب بچّہ گستاخی کرتا ہے تو اسے پھرن کی آستین سے مارا جاتا ہے......اس پر تمبا کو کا ڈبا نہیں پھینکا جاتا۔"

ان کی آواز بھاری ہوگئی۔

بلی قہوہ لے کر آئی۔ پنڈت خاموش ہو گئے۔ خواجہ نے بلی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ دھندلی خاموشی میں لپٹے ہوئے بجھے تیور دیکھ کر خواجہ سمجھ گئے کہ بلی کی مایوس آنکھوں میں ٹھٹھرے ہوئے آنسو بہت کچھ بیان کر رہے تھے۔ خواجہ کی آنکھوں نے قصّے کے اس پار وہ منظر بھی دیکھا جہاں اپنی مٹّی کی بو باس سے بے انتہا محبّت کرنے والا ایک شخص حقیقت سے منہ موڑ کر جب اپنی گلی میں آتا ہے تو اسے لگتا کہ جیسے وہ اس بستی کا فرد ہے ہی نہیں ......اس کے ہمسائے جب اسے دیکھ کر اصلی موضوع سے گریز کر کے کسی فرضی قصّے کو پکڑ کر بحث کرتے تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ اپنے سنگی ساتھیوں سے بچھڑ کے کسی اجنبی گلی میں بھٹک کے آیا۔ اس کے لئے لال چوک جیسے اڑ کر سات سمندر پار دنیا کے نقشے سے دور کہیں گم ہو گیا اور اس کے چاروں طرف ایک ایسی بھیڑ تھی جس میں انجان لاشوں کی شناخت کر کے یا تو جہلم میں بہایا جاتا یا پھر مٹّی میں امانت کے طور پر دفنایا جاتا۔

کیا وہ شخص اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب اس کی جنم بھومی پر بم برسائے

جاتے اور وہ کسی بم کی زد میں آ کر اپنی ممتا بھری مٹی میں گھل مل جاتا۔ یا پھر اسے اس دن کا انتظار تھا جب وہ نہتے کشمیری مسلمانوں کے سینوں پر برسنے والی گولیوں کے مینہ میں اشنان کر کے امر ہو جاتا۔ پھر اسے تاریخ سے کوئی نکال نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتا لل عارفہ (۱) اور شیخ نورالدّین ولیؒ (۲) کی طرح امر ہو جاتا......... قیامت تک........

اور اگلی رات خواجہ احمد قدوس نے اپنے جگری دوست ماسٹر ترلوک ناتھ کول کو نورالدّین شاہ کی ٹیکسی میں بٹھا کر جب ماسٹر جی کے مکان کے صدر دروازے کے تالے میں لرزتے ہاتھوں سے چابی اتار دی تو انھیں لگا کہ جیسے کوئی نیزے کی نوک سے ان کے جگر میں دائرہ بنا رہا ہے۔ پنڈت جی عمر بھر کے ساتھیوں سے رخصت لے رہے تھے۔ زبانیں بند تھیں۔ بولنے کے لئے جو الفاظ بچ گئے تھے وہ ہچکیوں میں دم توڑ رہے تھے......... نورالدّین شاہ نے زندھے ہوئے لہجے میں اپنے جوان بیٹے منظور احمد سے کہا:

---

(۱) ۱۴ویں صدی عیسوی کی مشہور سنت شاعرہ جنہیں کشمیری عوام عقیدت سے لل دید کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ دید کشمیری میں ماں کو کہتے ہیں لہٰذا اس عظیم شاعرہ کو کشمیری عوام ماں کا درجہ دیتے ہیں۔

(۲) ۱۴ویں صدی عیسوی کے ایک عظیم شاعر اور مبلغ اسلام۔ آپ ریشی فلسفہ سے منسلک تھے۔

''بیٹا! امانت میں خیانت نہ کرنا''

بیٹے نے باپ کو تسلّی دی:

''ابا جی! بے فکر رہیے ضرورت پڑی تو جان سپرد کر دوں گا۔''

''جگ جگ جیو۔''

ماسٹر جی نے منظور احمد کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے آشیرواد دیا۔

دس سال کے منّے نے اپنا کرکٹ بلاّ اپنے دوست نوید کو دیتے ہوئے کہا:

''لو یہ تم رکھ لو........ ہم دادی کے پاس جا رہے ہیں۔ مجھے پاپا نیا بلاّ لا کر دیں گے۔ ممّی کہتی ہے پاپا جھوٹ بولتے ہیں۔ وہاں خیموں میں کرکٹ گراؤنڈ کہاں ہو گا مگر تم سب کرکٹ کھیلنا۔ میں ایک دن ضرور آؤں گا''۔

نوید نے کرکٹ کا بلاّ اپنے صحن میں پھینک پھانک کر اپنی ماں کا دامن پکڑ کر پوچھا:

''ممّی! یہ یہاں سے کیوں جا رہے ہیں؟''۔

اس کی ممّی نے اوڑھنی کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا:

''یہ لوگ یہاں ڈر رہے ہیں۔''

نوید نے کچھ سوچ کر کہا:

''ہاں .... مجھے معلوم ہے یہ لوگ جلوسوں کے ڈر سے بھاگ رہے ہیں۔ اسی لئے جلوسوں پر فائرنگ کی جاتی ہے....... ممّی! ممّی!! میں بھی جلوسوں سے ڈرتا ہوں، نعروں سے مجھے بھی خوف آتا ہے....... چلو ہم بھی بھاگتے ہیں۔ منّے کے ساتھ۔''

ماں نے بچّے کو دامن سے لپٹاتے ہوئے کہا:

"نہیں بیٹا! ہم بھاگ نہیں سکتے........ وہاں ہمارا کوئی اپنا نہیں۔"

اور جب ٹرک کے پیچھے پیچھے سست رفتار سے جاتی ہوئی ٹیکسی نے نکّڑ پر موڑ کاٹا تو کتنی کھڑکیاں بند ہوگئیں اور کتنی بیبیوں نے شکتی بھابی سے بدلی ہوئی اوڑھنیوں (۱) سے آنسو پونچھ لئے۔ انھیں شکتی بھابی یاد آرہی تھی۔

...... اور دو دن کے بعد جب جموں سے واپس آنے والے ایک ہمسایہ ڈرائیور نے نورالدّین کو یہ دل دہلانے والی خبر دی کہ منظور احمد کی ٹیکسی سرینگر سے دس کلومیٹر دور شاہراہ کے ایک ویران گوشے میں لاوارث پڑی ہے تو وہ سکتے میں آ گئے اور گھر میں کہرام مچ گیا، گلی میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ محلّے کی عورتوں نے سینہ پیٹنا شروع کیا اور مرد نورالدّین کو دم دلاسا دینے لگے۔

نورالدّین نے جب دھول سے اٹی ہوئی ٹیکسی دیکھی تو ان کی ٹانگیں تھرتھرانے لگیں۔ وہ گرنے لگے تو خواجہ احمد قدوس نے سہارا دیا۔ آس پڑوس کے لوگ گھروں سے نکل کر ٹیکسی کے گرد جمع ہونے لگے۔

"کیا ہوا بھائی؟"

ہر کوئی نو وارد یہی سوال پوچھتا تھا........ خواجہ نے لوگوں سے معاملے کی نسبت بہت پوچھ تاچھ کی مگر کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ البتہ مسجد کے خدمت گار

---

(۱) اوڑھنی بدلنا: بہناپا۔ بہن بنانا۔

نے کھڑکی کے شیشے سے جھانک جھانک کر بہت کچھ دیکھا تھا مگر اس نے ڈرتے ہوئے صرف اتنا بتا دیا کہ رات کو اس جگہ ناکہ لگا تھا اور دیر تک بم چیخ ہوتی رہی۔ بہت کوششوں کے بعد جب ٹیکسی کی کھڑکی کھولی گئی تو نورالدین کی نظر دراز سے نکالے ہوئے کاغذوں میں ایک اجنبی کاغذ کی پرچی پر پڑی۔ انھوں نے تھرتھراتے ہاتھوں سے کاغذ کھولا اور عینک لگا کر عبارت پڑھنے لگے۔

از مقام بانہال

مورخہ: بھول گیا ہوں

پیارے نورالدین!

آداب عرض ہے۔

عزیزی منظور احمد کو بانہال سے دستگیر (۱) صاحب کے حوالے کر رہا ہوں۔ یہاں سے ہم ٹرک میں اپنے سامان کے ساتھ سفر کریں گے۔ منظور احمد مشکل سے مان گیا تھا، کہتا تھا اباجی کو کیا جواب دوں گا۔ سو تمہیں خدا کی قسم اسے ہرگز نہ ڈانٹنا۔ میں نہیں چاہتا کہ منظور احمد کا بھی، میرے منہ میں خاک وہی حشر ہو جو کچھ کشمیری تانگابان بھائیوں کا ۱۹۴۷ میں نگروٹہ کے مقام پر ہوا

---

(۱) حضرتِ عبدالقادر جیلانیؒ کو کشمیری عوام دستگیر کے نام سے پکارتے ہیں۔ کشمیری پنڈتوں کو اس بزرگ سے نہایت گہری عقیدت ہے۔

تھا(۱) سب کو میری طرف سے آداب کہنا۔ اپنا اور اپنے اہلِ خانہ کا خیال

---

(۱) اِس واقعہ کے بارے میں ریاستِ جموں وکشمیر کے سابق وزیرِ اعلیٰ مرحوم شیخ محمد عبداللہ اپنی خودنوشت میں یوں لکھتے ہیں: ''دوسری طرف مظفرآباد سے بارہمولہ تک ایک اور آفت مچی تھی۔ قبائیلوں نے خاص طور پر سکھوں کو چُن چُن کر اپنا نشانہ بنایا تھا۔ ان میں جتنے لوگ بھی جان بچا سکتے وہ سرینگر پہنچ گئے۔ اُن کی حالت بہت بری تھی۔ اکثر ان کے خویش واقارب قتل کردئے گئے تھے اور ان کا اثاثہ لوٹ لیا گیا تھا۔ بہت سے خود بھی گھائل ہوکر آئے تھے۔ ہم نے ان کی ڈھارس بندھانے کی حتیٰ الامکان کوشش کی اور ان کی مدد بھی کی۔ لیکن وہ اتنے سہمے ہوئے تھے کہ جلد از جلد بانہال پار کر کے جموں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ لیکن ہمارے پاس ٹرانسپورٹ کا انتظام نہیں تھا۔ جتنی گاڑیاں تھیں وہ مہاراجہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اور کچھ گاڑیاں پاکستان میں ہی روک لی گئی تھیں۔ میں نے اننت ناگ کے بیس بائیس تانگہ بانوں کو آمادہ کیا کہ ان مصیبت زدگان کو جموں پہنچائیں اور ہم سے منہ مانگے دام لیں۔ انہوں نے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا تو میں نے ان سے انسانی ہمدردی کے نام پر اپیل کی۔ آخرکار وہ آمادہ ہوگئے اور ان مصیبت زدگان کو حفاظت کے ساتھ جموں پہنچایا۔ لیکن ان کی نیکی ان کے لئے وبالِ جان بن گئی۔ جب وہ واپس لوٹ رہے تھے تو نگروٹہ کے قریب ایک سکھ ٹولی نے ان پر گھات ماری۔ ان کے تانگے چھین لئے اور ان کی ساری پونجی ہتھیالی اور پھر انہیں نہایت بے دردی سے قتل کرڈالا۔ ایک تانگہ بان کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور اس نے یہ خبر اننت ناگ تک پہنچادی۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک کہرام مچ گیا۔'' (آتشِ چنار از شیخ محمد عبداللہ)

رکھنا۔ خواجہ بہت یاد آرہا ہے۔ منزل پر پہنچتے ہی خیریت سے آگاہ کروں گا۔

تمہارا بھائی

ماسٹر ترلوک ناتھ

نورالدّین نے عینک اتاری تو جیسے دریا کا پشتہ ٹوٹ گیا۔ آنسوؤں سے ان کی لمبی سفید ڈاڑھی جل تھل ہوگئی۔

پولیس اسٹیشن کے احاطے میں لوگوں کا جم غفیر تھا۔ سب اپنا اپنا دکھڑا سنا رہے تھے......... نورالدّین کو لگا کہ جیسے ان کا لال اسی بھیڑ میں کہیں کھو گیا ہے۔ تھانیدار نے رپورٹ درج کی تو نورالدّین نے مایوس لہجے میں پوچھا:

''اب؟'' تھانیدار نے کسی اور کی رپورٹ درج کرتے ہوئے جواب دیا:

''اب کیا؟......... حضرت آپ گھر جا کر اطمینان سے بیٹھئے۔ یا تو کچھ روز میں لاش ملے گی یا پھر سرحد پار سے آپ کو بیٹے کی خیریت کا فون آئے گا۔ ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ اگر کوئی لاوارث لاش برآمد ہوئی تو آپ کو شناخت کرنے کے لئے طلب کریں گے اور جس دن آپ شناخت کرنے کیلئے نہیں آئیں گے ہم سمجھ جائیں گے کہ آپ کو سرحد پار سے فون آیا ہے۔''

یہ سنکر نورالدّین اندر سے کرچی کرچی ٹوٹ گئے:

''ربّا! کیا میں نے اسی لئے اپنے بیٹے کو پال پوس کر جوان کیا تھا؟''

گھر کی دہلیز پر بیگم نے سوجی ہوئی سرخ آنکھیں پونچھ کر ان کا گریبان

پکڑا:

''کہاں ہے میرا بیٹا؟''۔

نورالدّین نے بیگم کو سہارا دیکر بڑی مشکل سے صرف اتنا کہا:

''پولیس نے پرچہ چاک کیا ہے۔اس طرح رو رو کے بدشگونی نہ منا۔''

OOOO

باب چہارم

پتواس (۱)

محمد رمضان حجام کا دل سویرے ہی سے کسی انجانے خوف کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ بس اسٹینڈ پر کافی بھیڑ بھڑکا تھا۔ ریڑیوں پر پھل اور سبزیاں بیچنے والوں اور کنڈکٹروں کی ہانک اس کے جگر میں پھانس کی طرح چبھ رہی تھی۔ کئی گاڑیاں جب بھیڑ کی وجہ سے چھوٹ گئیں تو آخر کار کافی دھکا پیل کے بعد ایک ٹھساٹھس بھری گاڑی میں سوار تو ہوا مگر جگہ جگہ بنکروں پر جامہ تلاشی سے وہ آزردہ ہوگیا۔ اس پر سپاہیوں کی وارننگ پر گاڑی کے شیشے بند رکھنے کی وجہ سے اسے کچھ زیادہ ہی دق ہوگیا۔ کئی بار گھٹن کے سبب اس کا جی گھبرایا اور اس نے اترنے کا ارادہ بھی کیا، مگر اس اندیشے سے ارادہ ترک کیا کہ دکان کھولنے میں اگر تاخیر ہوگئی تو بندھے بندھائے گاہک ناراش ہوکر کسی اور دکان کا رخ کریں گے۔ اس پر یہ مصیبت بھی تھی کہ مشکل سے ایک طرف کے بس کرایہ کا بندوبست ہوا تھا۔ سویرے اس کی بیگم نورا نے چاولوں کا کنستر

---

(۱) کبوتروں کے بیٹھنے کی چھتری۔

کھڑکا کر اشارہ کیا تھا کہ اگر شام کو راشن کا انتظام نہ ہوا تو فاقہ گزرے گا۔

منی بس سے اترتے ہی اس کی جان میں جان آ گئی۔ کئی دکانیں کھل چکی تھیں اور خریداروں کا ہجوم امنڈ آیا تھا۔ اس نے ''یا پیر دستگیر'' کا نعرہ مار کر دکان کا شیٹر اٹھایا۔ ساری دکان کچرے سے بھری ہوئی تھی۔ پچھلی بار گلی میں ایک گشتی (۱) نے کسی راہگیر کو پکڑا تھا اور بھاگڑ پڑنے کی وجہ سے بازار دوپہر کو ہی بند ہوا تھا۔ پھر کئی دن تک ہڑتالوں اور کرفیو کا سلسلہ چلا۔ رمضان نے فرش پر پڑے ہوئے بالوں کی ڈھیریوں پر احتیاط سے جھاڑو پھیرا۔ پھر کرسیوں کو اچھی طرح جھاڑ جھٹک کر آئینے پر پانی کی پچکاری مار کر اسے جھاڑن سے صاف کیا۔ رفتہ رفتہ گاہک جمع ہونے لگے۔ اس نے نل پر حقے میں تازہ پانی بھر لیا اور جلدی جلدی پھونک مار کر ٹیروے (۲) سے اچھی طرح زائد پانی

---

(۱) ۱۹۹۰ء میں جب کشمیر کے اندر عسکریت کا آغاز ہوا تو اس دہائی میں دیگر اصطلاحوں کی طرح ایک اصطلاح ''گشتی'' کی بھی رائج تھی۔ کشمیری عوام ''گشتی'' اس بکتر بند گاڑی کو کہتے تھے جس میں بھارتی سکیورٹی فورسس کے اہلکار سوار ہوتے تھے جو اچانک کسی علاقہ کے گلی کوچوں سے گزر کر دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے یا گلی کوچوں سے گزرنے والے کشمیری نوجوانوں میں سے کسی کو بھی شک کی بنیاد پر دبوچ کر انٹروگیشن سینٹر پہنچاتے تھے۔ کشمیری نوجوانوں پر نوے کی دہائی میں ''گشتی'' لفظ کی دہشت قائم رہی۔

(۲) ٹیروا: حقے کی وہ نے جس پر چلم رکھتے ہیں۔

نکالا۔ کچھ دیر بعد چلم سے چنگاریاں لپکنے لگیں اور رمضان منہ سے دھویں کے مرغولے چھوڑنے لگا۔

ابھی دو چار گاہکوں کی حجامت کی تھی کہ یکا یک محلّے کی مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اعلان ہوا:

''اللہ اکبر! اللہ اکبر!! اللہ اکبر!!! حضرات! پولیس اسٹیشن میں کسی کی لاش لائی گئی ہے........ محلہ داروں سے گزارش ہے کہ وہ چوک میں جمع ہو جائیں''۔

''نعرۂ تکبیر........ اللہ اکبر۔''

آناً فاناً دکانیں بند ہوگئیں اور لوگ گلی کوچوں سے جوق در جوق نکل کر چوک میں جمع ہونے لگے۔ کسی نے کہہ دیا:

''شاید منظور احمد''۔ یہ سن کر محمد رمضان کا دل بیٹھ گیا:

''بیچارے نورالدّین........ ہائے افسوس!''۔

کوئی کہہ رہا تھا:

''افواہ ہے افواہ۔''

دفعتاً چوک جلسہ گاہ میں تبدیل ہوگیا۔ نورالدّین ایک دکان کے تھڑے پر چڑھ کر اونچی آواز میں بولنے لگے:

''نعرۂ تکبیر........ اللہ اکبر........ حضرات آپ سب سے گزارش ہے کہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ دکان دار بھائیوں سے استدعا ہے کہ دکانیں کھول دیں کیوں کہ عوام خورد و نوش کی اشیاء کے لئے پریشان و پراگندہ

خاطر ہیں........ خاص کر دوا فروش حضرات سے التماس ہے کہ وہ دکانیں کھول دیں۔ میں خواجہ احمد قدوس، حاجی علی بٹ اور پروفیسر محمود کے ساتھ پولیس سٹیشن جا کر معاملے کی نسبت معلوم کروں گا۔ مستورات براہ کرم گھروں کو لوٹ جائیں، اللہ اکبر۔''

ایک نوجوان نے جلسے کے بیچ سے اٹھ کر للکارتے ہوئے کہا:

''نہیں ہرگز نہیں! ہم جلوس کی صورت میں جائیں گے۔ باطل سے ڈرنے والے اے آسماں نہیں ہم۔ نعرۂ تکبیر........ اللہ اکبر........ نعرۂ رسالت........ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم........ یک نعرۂ پنج تن یک نعرۂ حیدری........ یا علیؓ!''۔

''یا علیؓ! یا علیؓ!'' کے نعروں سے زمین دہلنے لگی اور جلوس نکل پڑا۔ پُل پر سپاہیوں کی ایک ٹکڑی رائفلوں سے لیس راستہ روک کر کھڑی تھی۔ نورالدین جلوس کے آگے کھڑے ہو گئے:

''حضرات! خاموش، خدا کے لئے خاموش ہو کر بیٹھ جائیں۔ سب بیٹھ جائیں''

کچھ دیر نورالدین شاہ آفیسر کو ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ لوگوں کو جب لگا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھنے والی تو ایک پر جوش نوجوان اٹھ کر نعرے دینے لگا۔ آفیسر نے شاہ کو دھکا دیکر پرے کر دیا اور کمر بند سے پستول نکالی۔ آن کی آن میں بھڑ کیلے سپاہیوں نے دایاں گھٹنا زمین پر ٹیک کر کھٹ کھٹاک کھٹا کھٹ بندوقوں کے گھوڑوں کو پائے پر چڑھایا اور

شست باندھ لی:

"اے ظالمو! اے غاصبو!! کشمیر ہمارا چھوڑ دو!!!"

آفیسر نے ہوا میں فائر جھونک دیا اور بندوقوں سے چٹاخ پٹاخ گولیاں نکلنے لگیں۔ ہلچل مچ گئی .... دھکڑ پکڑ میں کسی کو ہوش ہی نہ رہا کہ کہاں جانا ہے۔ محمد رمضان معلوم نہیں کتنی گلیوں سے گزر کر گھاٹ پر پہنچا۔ کشتی میں سوار ہو کر اسے پتہ چلا کہ بھاگڑ میں اس کے جوتے وہیں رہ گئے ہیں۔ وہ بڑبڑانے لگا:

"معلوم نہیں کل پولیس کنٹرول روم میں میرے پھٹے پرانے جوتوں کو کتنے لوگ روتے، سر پیٹتے شناخت کرنے کے لئے آئیں گے۔"

دور سے تڑتڑاہٹ اب بھی سنائی دے رہی تھی .... ابابیلیں ہوا میں بدحواس ہو کر ادھر ادھر اڑ رہی تھیں۔ کبوتر ڈھابلیوں سے نکل کر اپنی پتو اس بھول گئے تھے۔

رمضان کی بیوی نورا بیگم نے دروازہ کھول کر جو اپنے شوہر کی یہ درد شا دیکھی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا:

"کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا؟ جوتے کہاں ہیں؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ دکان پر کون ہے؟"

اسی دوران میں اس کی بیٹی نرگس آئی۔ دونوں ماں بیٹی نے جب رمضان کو گھیرا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر کہا:

"تم لوگ یہ کریک ڈاؤن اٹھاؤ تو میں کچھ کہوں۔ نورا بیگم!

تمہارا منہ ہے یا کاشنکوف........ بَرَسٹ پر بَرَسٹ (۱) مارتی ہو"۔

اس نے پانی پی کر سارا ماجرا بیان کیا۔ پھر چادر اوڑھ کر تکیے کے ساتھ ٹیک لگائی۔ ابھی اس کی آنکھ لگی نہ تھی کہ بیگم نے نیا بکھیڑا کھڑا کیا:

"سنتے ہو! عبداللہ صاحب نے دو دفعہ آدمی بھیجا ہے"۔

رمضان نے منہ سے چادر ہٹا کر حیرانی سے پوچھا:

"کون عبداللہ؟ مونسپلٹی کا جمعدار؟ وہ کب سے صاحب ہو گیا؟"

نورا نے عاجز ہو کر کہا:

"وائے میرے خدایا! ارے وہ نہیں حاجی عبداللہ کریانہ والے"۔

رمضان یہ سنکر متفکر ہوا:

"ہوں، یہ کہو نا حاجی عبداللہ اینڈ سنز کریانہ مرچنٹس"۔

شوہر کے منہ پر فکر کی پرچائیں دیکھ کر بیوی نے پوچھا:

"کیا ہوا؟"

"نہیں کچھ نہیں"۔ رمضان نے حقّے کا نیچہ پکڑا۔

"بہت دنوں سے تقاضا کر رہے ہیں۔ کیا کروں؟ اگر یہی حال رہا تو بہت کے تو بھوکوں مر جائیں گے۔ خدا فضل کرے۔ نہ کسی میں ادھار چکانے کی حیثیت اور نہ کسی میں دینے کی طاقت"۔

---

(۱) انگریزی لفظ Burst کو عام کشمیری بَرَسٹ ہی کہتا ہے۔ مطلب گولیوں کی بوچھاڑ۔

بیت المال

جھٹپٹے کا سماں تھا یا صبح کاذب کے نور کا دھندلکا یا پھر چاندی رات کی مدھم روشنی۔ محمد رمضان کو لگا جیسے دریا کی لہروں کے چمچمانے سے ساحل جھلملا رہا ہے........ وہ مراقبے میں ڈوبے ہوئے ایک پراسرار لٹورئے قلندر کا دامن پکڑے بیٹھا ہے کہ اچانک دریا سے ایک خوفناک لہر اٹھی اور ''یا شیخ! یا شیخ!'' کی گہری اور گھنی آواز گونجنے لگی........ ذرا بھر طغیانی کا خیال نہ کرتے ہوئے قلندر اٹھتی لہر کی طرف گھٹنوں کے بل جانے لگا۔ اور جب لہر چادر کی طرح چھانے لگی تو رمضان سے رہا نہ گیا اور اس نے چھلانگ لگا کر قلندر کے پانی پر تیرتے ہوئے بال ہاتھوں سے پکڑ لئے۔ اس کی دونوں باہوں سے قلندر کے گیسو اجگر کی طرح لپٹ گئے۔ دونوں ڈوبنے لگے۔ ایک عجیب عالمِ حیرت رمضان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ کچھ دیر کے لئے اس نے اپنے تئیں مردہ اور اس عالمِ عجائبات کو عالمِ ارواح تصور کیا۔

پانی کا شاہی محل، پانی کے ستون، پانی کا فرش، پانی کے پلنگ، پانی کی دیواروں پر پانی کے فانوس جن کے درمیان سے مچھلیاں گزر رہی تھیں۔ ان رنگین مچھلیوں کے گلپھڑوں سے بلبلوں کی جگہ موتی، مونگے اور مرجان نکل کر ادھر ادھر بکھر رہے تھے۔ رنگ برنگے اور چمکیلے سانپ ستونوں سے بیلوں کی طرح لپٹے ہوئے تھے۔ دیواروں کے کونوں پر لٹکتی ہوئی قندیلیں جن میں پانی کی شمعیں فروزاں تھیں۔ ہر طرف لوبان کی خوشبو کے لپٹے اڑ رہے تھے۔ رمضان قلندر کا دامن پکڑ کر حیرت کے اس عالم میں کھو گیا حتیٰ کہ پانی کی

سیڑھیاں اترتے اترتے وہ ایک وسیع وعریض دیوان خانے میں داخل ہوئے جہاں ایک نورانی بزرگ تخت پر براجمان تھے۔اس پیرِ فرشتہ صورت کے چہرے سے جلال برس رہا تھااور آنکھوں سے ہیبت کے شعلے لپک رہے تھے........دونوں طرف بہت سے بزرگوار صفوں میں دست بدست حاضر تھے۔پھرنورانی بزرگ فرمانے لگے:

''شیخ عمادالدّین!''

عمادالدّین نے ہاتھ باندھ کرسر جھکاتے ہوئے جواب دیا:

''یا شیخ! حاضر ہوں۔''

''یہ کون تمہارے دامن سے لپٹا ہوا ہے؟''

''پیرومرشد! یہ بدنصیب اسی دیار کا باشندہ ہے جس پر میں مامور ہوں۔''

عمادالدّین نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔نورانی بزرگ نے ٹوکنے کے انداز میں کہا:

''مگر یہ تمہارے ساتھ کیسے آ گیا؟''۔

''حضورِ عالی! جب میں دربارِ فیض پناہ میں حاضر ہونے کی غرض سے روانہ ہوااس نے سوچا کہ میں غرقاب ہورہا ہوں،سو میری جان بچانے کے لئے اپنی جان جوکھم میں ڈال دی۔مجھ فقیرِ پر تقصیر کو کشف سے معلوم ہوا کہ یہ تیراکی کے فن سے نابلد ہے۔اگراسے اپنے حال پر چھوڑتا تو اغلب تھا کہ ایک معصوم کی جان تلف ہونے کا گناہ میرے نامۂ اعمال میں درج ہوتا،میں نے ازراہِ ترحم اسے اپنی معیّت میں رکھا۔حضور سے اس کے حق میں رحم کی درخواست ہے۔''

بزرگ کی آواز گرجنے لگی:

''مگر تم اس کا انجام جانتے ہو؟''۔

''رحم، رحم، رحم۔۔۔۔۔۔''

چاروں سے طرف فریاد ہونے لگی۔

نورا بیگم رمضان کو جھنجوڑ کر جگا رہی تھی:

''اٹھو، اٹھو۔۔۔۔عبداللہ صاحب آئے ہیں۔''

''رحم! رحم!! رحم!!!'' وہ بڑبڑا کر اٹھا۔

اس نے فوراً چپل پہن لی اور دوڑ کر صدر دروازہ کھولا۔:

''سلام علیکم، کیا رمضان بھائی! تم تو عید کا چاند ہو گئے۔''

''وعلیکم سلام حاجی صاحب!''

رمضان حیرت میں سوچنے لگا۔

''رمضان بھائی؟''

یہ الٹی گنگا کہاں سے بہنے لگی........ کہاں تو دور سے آواز دیتے تھے'' رمضے! ابے کہاں غائب رہتا ہے تو۔'' اور کہاں آج ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔

رمضان پھولوں کی ڈالیوں میں چھپے ہوئے اس ناگ کو دیکھ نہ سکا جو ابھی کچھ دیر میں اسے ڈسنے والا تھا۔ اس کی عقل میں یہی آیا کہ بہت ہوا تو قرض کا تقاضا کریں گے۔ کہہ دوں گا کہ آپ سے حالات پوشیدہ نہیں۔ حاجی عبداللہ نے اس کی کلائی پکڑ لی اور ساتھ لینے لگے۔

''رمضان صاحب! ذرا پردے کی بات ہے اس لئے خود چلا آیا''۔

رمضان انکساری سے دوہرا ہو گیا۔

''حاجی صاحب! غریب خانہ حاضر ہے''۔

حاجی نے انکار کیا اور دونوں چل کر قبرستان کے ایک صاف گوشے میں بیٹھ گئے۔قبرستان کے بازو میں میدان تھا جہاں محلے کے کچھ لڑکے کھیل رہے تھے........ رمضان نے محسوس کیا کہ میدان میں کوئی جوان نہیں۔وہ سوچنے لگا۔کہاں گئے ہمارے نوجوان؟ حاجی شاید وہ دیکھ نہ سکا جو رمضان کو دکھائی دے رہا تھا۔اس نے جذبات سے عاری ہو کر کہا۔:

''رمضان بھائی! مبارک ہو، تمہارا بیٹا خیریت سے منزل پر پہنچ گیا ہے۔کل میرے نوکر غلام حسن کا بیٹا بلال احمد فون کر رہا تھا۔اس نے ہی الطاف احمد سے میری بات کرائی۔خدا تمہارے بیٹے کو عمرِ دراز اور استحکام عطا کرے........ بے حد سعادت مند لڑکا ہے۔''

رمضان کی آنکھوں میں آنسو آئے۔اس نے ہاتھ جوڑ کے حاجی کا شکریہ ادا کیا۔:

''حضرت! خدا آپ کے اہل و عیال کو سلامت رکھے۔دولت، عزّت اور اقبال میں ترقی دے۔بس میرے دل سے پھانس نکل گئی۔آپ کا نہایت احسانمند ہوں۔''

حاجی نے رمضان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر کہا۔:

''ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو تم۔مجھے شرمندہ نہ کرو۔اچھا تم سے ایک

بات کہنی تھی سوچتا ہوں کہاں سے شروع کروں۔ رمضان! تم جانتے ہو کہ میں ایک سیاسی پارٹی سے وابستہ ہوں۔ میرا مطلب ہے تھا۔ یعنی کئی بار اخباروں میں اپنی سابقہ سیاسی پارٹی سے اظہارِ لاتعلقی کا اشتہار دے چکا ہوں۔ مگر اس کے باوجود کچھ روایتی حریفوں سے کھٹکا لگا رہتا ہے۔ مثلاً عبدالکبیر۔ میں ان کی بہت عزّت کرتا ہوں۔ مگر تم جانتے ہو کہ ہماری سیاسی سوچ الگ ہے۔ مطلب تھی۔ میں نے کئی بار انہیں الیکشن میں شکست دی ہے۔ کئی بار مونسپلٹی کا وارڈ ممبر منتخب ہوا جو کچھ بن پڑا کر دیا۔ عوام کی بہبودی کے لئے۔''

کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ حاجی نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ وہ کہنے لگا:

''سنا ہے........ سنا کیا مجھے پکّی خبر ملی ہے کہ عبدالکبیر نے اپنے بیٹے رفیق احمد کو بھی سرحد پار بھیجا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ رفیق کے لوٹتے ہی اس کا باپ پرانی عداوت نکالنے کے لئے اسے میرے خلاف اکسائے گا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ .... دراصل میرے بھائی تمہارا اور میرا گھر کا معاملہ ہے........ تم جانتے ہو کہ خدا کے فضل سے میرے چار بیٹے ہیں۔ تین آل اولاد والے۔ رہا شبیر احمد تو اسے مشکل سے پونہ کے ایک میڈیکل کالج میں سیٹ ملی ہے........ بھاری رقم کے عوض۔ وہ بیوقوف ضد کر رہا تھا کہ سرحد پار جاؤں گا۔ بڑی منتوں کے بعد اسے پونہ روانہ کر دیا۔ اب سمجھو، یعنی کہ میرے پانچ بیٹے ہیں۔ نذیر احمد، نصیر احمد، بشیر احمد، شبیر احمد اور الطاف احمد''۔

اب حاجی کے پاس کہنے کیلئے کوئی لفظ نہیں بچا۔ رمضان نے ایک گہری

سانس لی اور نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں کہا:

''حاجی صاحب! آپ یہ تازہ قبریں دیکھ رہے ہیں۔وہ کونے میں جان محمد درزی کے بیٹے ارشاد احمد کی قبر ہے۔ماں باپ کا تینترا (۱) بیٹا تھا۔ تین بہنوں میں اکیلا بھائی۔اور وہ محمد صدیق کے گھر داماد شوکت احمد کی قبر ہے۔وہ تاجہ بیگم کا اکیلا کماؤ لال وہاں ابدی نیند سو رہا ہے اور یہ جو امانت کے طور پر دو میتیں یہاں دفنائی گئی ہیں ان بیاباں مرگ جوانوں کے بارے کسی کو معلوم نہیں کہ کون تھے، کہاں کے تھے۔اٹھئے دیر ہو رہی ہے .... مغرب کا وقت ہوا چاہتا ہے۔''

اور وہ دونوں چلنے لگے۔

رمضان اپنے گھر کے صدر دروازے پر رک گیا۔کچھ سوچ کر حاجی سے کہا۔:

''آپ ذرا سا انتظار کیجئے۔میں بس یوں گیا اور یوں آیا۔''

وہ جھٹ سے اندر گیا اور نرگس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔:

''دیدو، یہ سونے کی انگوٹھی مجھے دیدو، ابھی اسی وقت فوراً۔''

بیوی نے گھبرا کر ٹوکا۔

''ارے! یہ کیا بہکی بہکی باتیں کرر ہے ہو۔یہ اس کی سگائی کی انگوٹھی ہے''۔

رمضان نے کھینچ کر نرگس کی انگلی سے انگوٹھی نکالی۔اس کی انگلی چھل گئی۔

---

(۱) وہ بیٹا جو تین بیٹیوں کے بعد پیدا ہو۔

وہ بلبلا اٹھی۔رمضان تیز قدم بڑھاتا ہوا صحن میں آیا۔نورا اور نرگس اس کے پیچھے دوڑیں۔اس نے حاجی کا ہاتھ پکڑا، انگوٹھی اس کی ہتھیلی پر رکھ کر بولا۔:

''لیجئے! میری بیٹی کی سگائی کی انگوٹھی ہے........اسے بیچ کر میرا قرضہ مجرا کیجئے۔حضرت! اپنے لخت جگر کو اس پار بھیجئے۔پھر دیکھئے جب سرحد پر لاشیں گرتی ہیں تب باپ کا کلیجہ کیسے تھر تھر کانپ اٹھتا ہے۔میرا بیٹا اس بدنصیب قوم کو آزاد کرانے کے لئے نکلا ہے۔کسی کی کٹھ پتلی بننے سے تو بہتر ہے کہ وہ زندہ در گور ہو جائے''۔

نورا سب معاملہ سمجھ گئی، غصّے میں بولی۔:

''در گور ہو جائیں اس کے دشمن اور بد خواہ اور وہ جو پھسا کو(۱) بیچ کر لکھ پتی بن گئے۔''(۲) نورا کے طعنے کا نیزہ حاجی کے سینے میں ترازو ہو گیا، تاؤ میں آکر بولا۔:

''رمضان نائی! اپنی جورو سے کہو کہ اوقات میں رہ کر بات کرے۔جس کے پاس تل ہو وہی تیل نکالتا ہے۔تم لوگ کس بات پر اترا رہے ہو''۔

یہ غل غپاڑہ سن کر ہمسائے جمع ہوئے۔حاجی نے نکلنے میں ہی عافیت سمجھی۔نرگس نے اپنے باپ کو گلے لگایا۔وہ اپنی انگلی پکڑ کر رو رہی تھی۔

---

(۱) گھٹیا تمباکو

(۲) ۱۹۹۰ء میں کشمیر کے اندر کچھ ہی لوگ لکھ پتی تھے۔اب کروڑ بلکہ ارب پتیوں کی گنتی کرنا دشوار ہے۔

دوسرے روز مغرب کی نماز کے بعد ایک آٹو رکھشا رمضان کے مکان کے آگے رک گئی۔ آٹو رکھشے میں سے ایک نوجوان اترا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ رمضان نے جب دروازہ کھولا تو سامنے ایک بوری دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔:

''یہ کیا ہے بھائی؟ اور آپ کون ہیں؟''۔

اجنبی نے ایک خط رمضان کے ہاتھ میں تھمایا اور آٹو میں سوار ہوکر ڈرائیور سے کہا۔:

''چلو جلدی نکلو''۔

رمضان نے نرگس سے خط پڑھوایا۔:

برادرم محمد رمضان صاحب! السّلام علیکم۔

کل کے واقعے کی مجھے اطلاع ہوئی۔ تمہارا استقلال قابلِ فخر ہے۔ کچھ ضروری اشیاء از قسم چاول، آٹا، دالیں و مسالا جات بھیج رہا ہوں۔ کیا کروں، لوگوں نے مجھے بیت المال کا امین بنایا ہے۔ کوشش کروں گا کہ امانت مستحقین تک پہنچے۔ میرے حق میں دعا کرنا۔

منظور کی خبر چھوٹی تھی اس کی بازیابی کے لئے خاص طور پر دعا کرنا۔

والسلام خیر اندیش

نورالدّین شاہ

OOOO

باب پنجم

نروان اور روشنی کی واحد کرن

پہلے پہلے کھرانداور گلے سڑے زخموں سے اڑنے والی بھقر بو کے بھبھکوں سے اس کا جی متلایااور اس نے بہت دنوں تک کھانا پینا چھوڑ دیالیکن جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیااور بھوک سے پر پُرزے جھڑنے لگے تو خود کے زخموں کی بساند بھی گوارہ کرلی۔آج دیودار کی لکڑی کی سوندھی سوندھی خوشبو کے ہلکے جھونکوں نے اسے ان ہاؤس بوٹوں کی یاد دلاکر آبدیدہ کردیا جہاں وہ سرینگر کے ہوائی اڈے پر اترنے والے گورے سیّاحوں اوران کی میموں کوٹھہراتا تھا۔کتنے دنوں کے بعداس نے عفونت بھری فضاسے باہر آکر سانس لی۔اس نے اندازے سے محسوس کیاکہ وہ کسی ایسے کمرے میں داخل ہواہے جس میں دیودار کی لکڑی سے تختہ بندی کی گئی ہے۔

"بیٹھ جاؤ!"ایک پاٹ دار آواز نے اسے چونکادیا۔

وہ جہاں کھڑاتھاوہیں فرش پر بیٹھ گیا۔آواز پھر گونجی:

"شرماجی!اسکے ہاتھ کھول دیجیۓ۔آنکھوں سے پٹی بھی ہٹائیۓ۔"

کچھ لمحوں کے لئے اسے یقین ہی نہیں آیا۔اس کے ہاتھوں کی رسّیاں

کھول دی گئیں۔اسے لگا جیسے اس کے دونوں ہاتھوں کو لقوہ مار گیا ہے۔اس نے داہنے ہاتھ سے بائیں کلائی ملنی شروع کی۔ایک دم روشنی کے تیز فوارے سے اس آنکھیں چندھیا گئیں۔ایک لمحے کے لئے اس نے داہنی باہ سے آنکھوں کو ڈھک لیا۔

''بیٹھ جاؤ!........ادھر کرسی پر۔''

وہ لنگڑاتے پاؤں گھسیٹتے کرسی کے پاس پہنچا۔دونوں ہاتھوں سے کرسی کے بازو پکڑ کر بیٹھ گیا۔اس کے منہ سے سسکاری نکلی۔شاید کسی سوئے ہوئے زخم کی سلسلاہٹ نے اسے بے چین کر دیا۔چوبی کرسی کے آگے ایک لمبی اور مزّین میز تھی جس کی دوسری طرف موینگ چیر پر ہیومن رائیٹس کمیشن کا ایک کارندہ مسٹر نریش کمار چٹر جی بیٹھا تھا۔قیدی کا دھیان کمرے کی سجاوٹ کی طرف تھا۔چٹر جی کے عقب میں دیوار پر دیودار کی لکڑی کے فریم میں جڑی موہن داس کرم چند کی تصویر تھی۔وہ گاندھی جی کی پر اسرار اور فقیرانہ مسکراہٹ میں کہیں کھو گیا۔ایسی اسراری مسکراہٹ اوتار کے ہونٹوں پر تب آتی ہے جب اسے نروان حاصل ہو جاتا ہے اور وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی واحد کرن دیکھتا ہے اور آتما کی شانتی کے بعد جب اوتار آنکھ موند لیتا ہے تو روشنی کے سینے میں خنجر بھونکنے کے لئے کئی ہاتھ اٹھتے ہیں۔

........مسٹر چٹر جی نے قیدی کو اپنی آمد کے مقاصد کی پوری جانکاری دی۔چونکہ باقی قیدیوں کے مقابلے میں وہ زیادہ پڑھا لکھا تھا اس لئے دوسرے قیدیوں کے حالات کی ترجمانی کے لئے اس کا انتخاب کیا گیا تھا۔

قیدی بھی بہت بھرا بیٹھا تھا، بس چھیڑنے کی دیر تھی۔ اس نے پوری کتھا ابتداء سے بیان کرنی شروع کی:

''سر! میرا نام منظور احمد شاہ ہے۔ کشمیر یونیورسٹی سے انگلش میں پوسٹ گریجویشن کی ہے۔ بہت برسوں تک جب نوکری نہیں ملی تو ٹیکسی خرید کر روزگار کا بندوبست کیا۔ مجھے رات کے تین بجے کے قریب ہائی وے پر پکڑا گیا...... یہاں کتنے دن ہو گئے اب یاد نہیں ...... کچھ دن اندھیری کوٹھری میں اذانیں سن کر یاد رکھنے کی کوشش کی پھر جسم پر اتنے گھاؤ لگ گئے کہ ان کی گنتی میں دنوں کی گنتی بھول گیا۔'' کچھ دیر کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ چٹر جی بولا:

''شاہ جی! کوئی چائے یا سگرٹ منگاؤں؟''۔

منظور نے نفی میں سر ہلایا۔

''جی نہیں شکریہ! میں پنڈت فیملی کو ٹنل کے اس پار چھوڑ کے آ رہا تھا۔ گاڑی روک لی گئی۔ ٹیکسی سے اتار کے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دیا گیا۔ کافی دیر تک ہاتھ اوپر رکھنے کی وجہ سے میرے بازو شل ہو گئے۔ میں نے ذرا سا جو بازو نیچے کر دئے تو ایک سپاہی نے کمر پر لات ماردی۔ کافی گالی گلوچ کر رہے تھے۔ لگ بھگ سب کے سب تاؤ میں تھے۔ پھر مجھے جیپسی میں بیٹھے آفیسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے پوچھا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟''۔

میں نے پورا ماجرا بیان کیا تو پتہ نہیں اس نے کس بھاشا میں سپاہی سے

کچھ کہہ دیا۔جس نے مجھے لات مار کر نیچے گرادیا۔اور دس بارہ جوان میرے اوپر پل پڑے۔جیسے شکر پارے پر چونٹیاں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ہاتھ پاؤں باندھ کر لاری میں بوری کی طرح دھکیل دیا گیا۔دودن کے لئے کیمپ میں رکھا گیا۔سرسری سوالات پوچھے گئے۔ایک آفیسر نے پوچھا:

''کیوں بھگادیا پنڈتوں کو؟''۔

میں نے کہا:

''سر!وہ خوف زدہ ہوکر خود بھاگ گئے''۔

اس نے ماں کی گالی دی:

''تم حرامیوں نے ڈرا دھمکا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔''مجھ سے ماں کی گالی برداشت نہیں ہوئی۔میں نے بس اتنا کہا تھا:''سر!آپ کے پاس فورس ہے،طاقت ہے آپ پنڈتوں کو روک سکتے تھے۔ان کی بستیوں میں پہرا چوکی بٹھا سکتے تھے''۔

یہ سن کر وہ آپے سے باہر ہوگیا اور تان کے ایسا تھپڑ مارا کہ میں گھموڑی لیکر نیچے گر گیا۔پھر اس نے اپنے ماتحت سے کہا:

''انصاری!اس بھینٹ بکرے کو انٹروگیشن سنٹر بھیج دو۔لکھ دو کہ او گر وادیوں کو چھوڑ کر آرہا تھا ضبطی میں پستول دکھادو۔اقبالِ جرم پر دستخط لے لو۔ورنہ گولی سے اڑادو اور لاش کسی جوہڑ میں پھینک کر آؤ۔حرام زادہ ہمیں ہماری ڈیوٹی سکھاتا ہے۔''

''تو سر میں نے کورے کاغذ پر دستخط کردئے۔''

منظور احمد رونے لگا۔ چٹرجی نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔:

''آئی ایم سوری، پانی پیو........ پھر؟ پھر کیا ہوا؟''

اس نے شرما کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا، ڈرتے ہوئے پانی پیا اور ہونٹوں کو ہتھیلی سے صاف کرتے ہوئے بولا۔:

''سر! جب ہمیں لاری سے یہاں لا کر اتارا گیا، کئی قیدیوں کو نیم برہنہ کر کے کمپاؤنڈ میں کانٹے دار تار سے چابک لگائے جا رہے تھے۔ زخمیوں کے جسموں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے، کپڑے تار تار تھے۔ ہمیں دیکھ کر ایک آفیسر نے ایک اہلِ کار سے کہا:

''دیوانکر! نئے رنگروٹوں کی آرتی اتارو۔''

''پھر ہمارے لباس کا چیتھڑا چیتھڑا اڑنے لگا۔ جیسے دھنکی چل رہی تھی۔''

منظور کی آنکھوں سے برسات ہو رہی تھی۔ کچھ دیر وہ خاموش رہا۔:

''سر! آپ خود دیکھئے کال کوٹھری میں لگ بھگ پچاس قیدیوں کو ٹھونس کر رکھا گیا ہے۔ کوٹھری نہیں بھٹا ہے صاحب! اندر اتنی گرمی، حبس اور گھٹن ہے کہ ایک گھنٹے میں کچی اینٹ پک کر ٹھن ٹھن بجنے لگے۔ ایک کونے میں پیشاب پھیرنے سے کھراند کے ایسے بھبکے اٹھتے ہیں، ایسے بھبکے کہ آدمی اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ کر خودکشی کر لے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دماغ سڑ گیا ہے۔ اور اس میں کیڑے کلبلا رہے ہیں۔ ایک چھوٹی سی ناند میں مویشیوں کی طرح بچے کچے چاول اور ادھ پکی دال ڈال کر کھلایا جاتا ہے۔ بوریا بستر ا کچھ نہیں۔ فی قیدی ایک ایک موٹے اون کا پرانا کمبل دیا گیا ہے۔ اسے ہم دجالی

کہتے ہیں۔ دن بھر چٹ چٹ جوئیں مار کر رات کو جو تھک ہار کر نیند آنے لگتی ہے تو یکا یک ڈنڈے مار مار کر جگایا جاتا ہے۔:

''اٹھو! اٹھو!! فلاں کے مہندی لگانی ہے۔''

پہلی بار جب مجھے انٹروگیشن روم میں لیا گیا تو خوف کھانے اور عبرت حاصل کرنے کے لئے میری آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی........ کمرے میں ہولناک اور دہشت انگیز اوزار اور ہتھیار دیکھ کر میری روح کانپ اٹھی۔ رسّیاں، لاٹھیاں، زنگ آلودہ کیلیں، چاقو، بغدے، پٹے، پلاس، بجلی کے تار، نمک اور مرچ کی ڈھیریاں۔ اور بھی نہ جانے کیا کیا سامان وحشت کا۔ تیز روشنی کا ایک بلب میری آنکھوں کے سامنے لاکر ٹکا دیا گیا۔:

''صاف صاف بولو گے تو مہندی لگنے سے بچ جاؤ گے۔''

ایک صاحب نے تیز دھار والے چاقو سے اپنے ناخن چھیلتے ہوئے کہا۔ میں نے حقیقت جو بیان کی تو اس نے ڈپٹ کر کسی سے کہا۔:

''کمار! یہ ایسے نہیں مانے گا۔ کپڑے اتار دو سالے کے۔''

''مجھے ننگا مادر زاد کیا گیا اور بھگو بھگو کے مارا گیا۔ میں اپنی بُو لگائے مار سہتا رہا............ پھر دونوں پاؤں میں رسّی ڈال کر لٹکا دیا اور تب تک پٹوں سے مارا جب تک میں لٹکتے لٹکتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ پتہ نہیں کب انٹروگیشن روم سے آنے والی دلخراش چیخوں سے مجھے ہوش آیا۔ میرا سر کسی ساتھی کی گود میں تھا اور وہ دجّالی کے گوشے سے مجھے ہوا دے رہا تھا۔

اس کے بعد کیا دن کیا رات ایک لمحے کے لئے سونے نہیں دیا۔ آنکھ لگتے

ہی ڈنڈا مار کے جگایا جاتا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارے کھانے میں خواب آور گولیاں ملائی جاتی ہیں۔ رات کو آنکھوں سے پٹی ہٹا کر کمپاؤنڈ کے ایک کونے میں عارضی ٹٹی کی طرف رفعِ حاجت کے لئے گالیاں دے دے کر، ڈنڈے مار مار کر ہانکا جاتا ہے۔ ایک گھڑے کے اوپر دو انٹیں رکھی گئی ہیں۔ اکثر کے پاؤں اور چوتڑے زخمی ہیں اس لئے باہر نکلنے سے گریز کرتے ہیں۔ کچھ دن گزر گئے کہ پوچھ تاچھ کے لئے نئی پارٹی آئی۔ آدھی رات کو آواز آئی۔:

''شاہ کو گھسیٹ کر لے آؤ۔''

یہ سن کر میری جان نکل گئی۔ دو چار جوانوں نے میرے گلے میں پٹہ ڈال کے مجھے گھسیٹنا شروع کیا۔ کوٹھری میں میرے ساتھی بڑبڑانے لگے: ''ان اللہ مع الصّابرین''۔ (بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

''پھر کپڑے اتارے گئے۔ پہلے پرانے زخموں سے کھرنڈ اتار دیا گیا۔ جب خون کی بوندیں رسنے لگیں تو زخموں پر کھارے پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا۔ میں بلبلا اٹھا۔ لنڈکریاں کھانے لگا...... ایسا درد، ایسی جھل جھلاہٹ، ایسی تپک، ایسی تپش، ایسا کرب کہ جس سے چھوٹنے کے لئے آدمی خوشی خوشی موت کو گلے لگانے پر راضی ہو جائے۔ میں گڑگڑا کر رونے لگا:

''ہاں میں دہشت گرد ہوں۔ میرے پاس کلاشنکوف ہے۔ بھگوان کے لئے مجھے پھانسی پر چڑھا دیجئے۔ میرا انکاؤنٹر کیجئے۔''

مگر میری ساری گریہ وزاری پتھر نچوڑنے کا عمل ثابت ہوئی۔ چھ فٹ

لمبے تین فٹ چوڑے تختے پر اوندھے منہ لٹایا اور بڑی دیر تک میرے تلوؤں کو پٹوں سے تڑاخ تڑاخ پیٹتے رہے۔''

منظور احمد نے اپنے تلوے ایک ایک کر کے دکھائے۔اس کے تلوؤں کی پھٹکیاں دیکھ کر چٹر جی کے منہ سے لمبی سرد آہ نکلی........

''ہے بھگوان!''۔

منظور بولا:

''سر! ایک کے تلوے میں اتنا بڑا شگاف پڑ گیا ہے کہ اس میں آسانی سے پھانا رکھا جا سکتا ہے''۔

منظور نے پاؤں نیچے اتارتے ہوئے کہا۔چٹر جی کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔بولا:

''سنا ہے کچھ دن پہلے تم لوگوں سے ملنے کچھ صحافی آئے تھے''۔

منظور نے اثبات میں سر ہلا کر کہا:

''ہاں سر آئے تھے، سب ہماری بپتا سن لی، ہمارے ایک ساتھی نے جب مسئلہء کشمیر کی تاریخی اور سیاسی حیثیت پر تقریر کی تو ایک پتر کار نے آفیسر سے کہا۔:

''آفیسر ہمارا کام ہو گیا۔گولی سے اڑا دو مادر چودوں کو۔انہیں جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔سالے جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں موتتے ہیں۔''

یہ سنکر باقی صحافی اس سے بہت ناراض ہو گئے۔

ایک صحافی نے آفیسر سے پوچھا ان میں اکثر بے قصور لگتے ہیں، اتنے

لوگوں کو کیوں اٹھا کر لاتے ہو۔ آفیسر بولا صاحب! ۱۹۸۹ سے ہی کشمیر میں کام کرنے والی بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے سارے دروازوں پر تالے چڑھنا شروع ہوئے۔ آج کی ڈیٹ میں کشمیر کے اندر ایک فرد ایسا نہیں جو ہمیں حقیقی صورتحال کی جانکاری دے سکے۔ اس لئے یہ ہماری اسٹریڈ جی کا ایک حصّہ ہے کہ دس کو پکڑ کر لاؤ تو ایک جھپیٹے میں آئے گا۔ کشمیری قوم کے پھیر پھار سے آپ واقف نہیں۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ کس کشمیری کے پھرن کے نیچے کانگڑی ہے اور کس نے کلاشنکوف چھپا کے رکھی ہے۔ یہ ملک کی سلامتی کا معاملہ ہے، ہماری ذرا سی چوک بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔''

چٹر جی نے آنکھیں موند لیں وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر جانے کیا سوچ کر چپ ہو گیا۔ منظور احمد نے کتھا جاری رکھی۔:

''کچھ روز قبل ایک اور پارٹی آئی۔ مجھے اتنے کرنٹ لگائے گئے کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو پھر سوالات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔:

''کیا کیا ہتھیار ان کے پاس تھے۔ کہاں سے آرہے تھے۔ سرحد کہاں سے عبور کی تھی۔ اور کس کس نے ان کی مدد کی؟؟'۔

اس بار میں بالکل خاموش رہا۔ اور سچ بات یہ ہے کہ اگر مجھے ان کے مطلب اور فائدے کی کسی بات کا علم بھی ہوتا تو میں ہرگز نہیں بولتا۔ کٹ جاتا مگر نہیں بولتا۔ مجھے چپ چاپ دیکھ کر ان کے ایک آفیسر نے کہا۔:

''سالے کے پچھواڑے میں مرچیں ڈال دو، سب اگلے گا........''

یہ دو دن پہلے کا واقعہ ہے۔ کل ننگا کر کے پلاس سے میری ڈاڑھی اور جسم

کے نازک حصّوں کے بال نوچے گئے۔ میں چوتڑوں کے بل بیٹھ نہیں سکتا۔سر! ایک معصوم کی ٹانگ کے بھمبھا کے(۱) میں ستلی پروئی گئی ہے وہ کئی ہفتوں سے یہاں پڑا اسڑ رہا ہے۔'' یہ سنکر چٹرجی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔اس نے رومال نکالا۔شرما کو لگا کہ بھانڈا پھوٹ گیا۔اور چٹرجی کے دل میں قیدیوں کے لئے ہمدردی پیدا ہوگئی۔اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔اس نے تاؤ میں آکر کہا:

''منظور! تم کیا سمجھتے ہو کہ مسٹر چٹرجی اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ تمہارے نام نہاد مجاہد مشتبہ مخبروں کی رانوں میں اسٹو جلا کر انسانی چربی سے کس آزادی کے چراغ روشن کر رہے ہیں.......وشواس گھاتی جس گھر میں پناہ لیتے ہیں اسی میں سیندھ لگاتے ہیں۔سالے، حرامی، بھانڈ جب بھی دیکھو چھکری(۲) گاتے رہتے ہیں۔تم ملک کے ٹکڑے کرنے کے لئے کلاشنکوف اٹھاؤ اور ہم تمہیں بھارت رتن پیش کریں؟۔''

یہ سنکر منظور کا پارہ چڑھ گیا۔اس کی بھی جان بھاری ہوگئی تھی بولا:

''شرما جی! آپ کو ہمارے گھر کے معاملے میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں اور کس ملک کے ٹکڑے کرنے کی بات کر رہے ہیں آپ؟ آپ لوگوں نے بھاری چٹان کے نیچے ہمارا ہاتھ دبا کے رکھا ہے۔ہم اپنا ہاتھ نکال

---

(۱) بھمبھا کا: وہ بڑا چھید جو آر پار ہو جائے۔

(۲) کشمیری موسیقی کی ایک معروف صنف

کر کھلی ہوا میں سانس لینا چاہتے ہیں۔آپ ہمارے گھر میں آگ بجھانے آئے تھے۔آپ نے تو آگ بجھا کر گھر پر ہی قبضہ جمالیا۔آپ جن قبائلوں کو کھدیڑنے آئے تھے ان کے ساتھ کئی نسلیں مر کھپ گئیں۔اب آپ کو کھدیڑنے کے لئے ہم کتنی نسلوں کی بلی چڑھائیں گے“۔

یہ سن کر شرما آپے سے باہر ہو گیا۔اس نے چٹر جی کی موجودگی میں پستول نکال کر منظور کی چھاتی پر تان کی:

”سالے! حرامی!! ایک لفظ بھی آگے منہ سے نکالا تو ادھر کے ادھر شوٹ کردوں گا اور لاش ایسے چھپاؤں گا کہ قیامت تک گھر والوں کو سراغ نہیں ملے گا........ مادر چود۔“

چٹر جی نے کرسی سے فوراً اٹھ کر شرما کے ہاتھ سے پستول چھین لی اور اسے کرسی پر بٹھا دیا:

’شرما جی! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ چٹر جی نے غصّے میں کہا۔

منظور کو ایک جوان نے گریبان سے پکڑ کر کمرے سے باہر لیا۔

منظور کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی چھا گئی۔چٹر جی نے سگریٹ سلگائی اور وہ کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر دیکھنے لگا۔اسے سگریٹ کے دھویں میں کافی دیر تک دھندلا دکھائی دیا۔

مقتل

یہی مقتل ہے شاید
اسی کو قربان گاہ کہتے ہیں

یہ کونے میں پڑا ہوا
زنگ کھائی ہوئی کو بڑی کیلوں کا ڈھیر
یہ کیلیں........
نہ جانے کتنی صلیبوں میں گڑتے وقت
باغی ہونے کی پاداش میں
اپنے بوسیدہ جسموں سے
کوڑھ ٹپکا رہی ہیں

حلق میں دبی ہوئی چیخوں کی بے کفن لاشوں کو
ڈھانکنے والی چھت
سفیدے کی بل کھائی ہوئی کڑی
کڑی........ جو رسیوں پر جھولتی
جوانیوں کے پھڑ پھڑانے سے چرمرا کر
ہل گئی ہے

شبہ رگوں میں رک رک کے بہتے ہوئے
لہو کے آخری قطروں کی سوزش سے
پگھل گئی ہے

یہ تازہ مٹّی کی کافوری خوشبو میں رچا ہوا
اوبڑ کھابڑ گورِ غریباں
کہ جس کے نیچے دبے ہوئے
کنوارے سپنے،
جنہیں نہ جانے کن وقتوں کے مسیحا اپنی
سواریوں کی چاپ سے جگائیں گے

یہ دھمبوڑیوں کا چھتا ہے
یا کوئی بوسیدہ بوری کیل پر لٹک رہی ہے
کہ جس کے پہلو میں ٹین کی دیوار پر
ابلتے خون کا چھینٹا

out,damned spot! I say.

(Macbeth: William Shakespeare)

تجھے کس سفاک قاتل کے خنجر کی نوک سے
اچھالا گیا ہے؟

کیا ہے خوں مرا پامال یہ سرخی نہ چھوٹے گی
اگر قاتل تو اپنے پاؤں سو پانی سے دھووے گا

(میر تقی میرؔ)

یہ کیسے باغِ لالہ کا خواب ہے
یہ کیسی جنّت سے
بچھڑ جانے کا عذاب ہے؟........

منظور احمد خواب اور بیداری کے عالم میں یہ بڑبڑا رہا تھا کہ اچانک اسے لگا کہ ٹین کے شیڈ کا دروازہ ایک ہیبت ناک چیخ کے ساتھ کھل گیا۔ اور ایک ڈراؤنا سایہ اندر آیا۔ منظور ہیبت زدہ ہو کر سائے سے کہنے لگا:

''آؤ آؤ میرے قاتل! میرے جلاّد! کیسے قتل کرو گے مجھ کو؟ رسّی پر لٹکا کے پھانسی دو گے؟ یا گلے پر خنجر پھیر کر شہہ رگ کا درّہ کھولو گے؟ یا پھر چاقو سے گود گود کے۔ بولو سائلینسر لگی پستول کی گولی سے دل میں چھید کروَ گے یا اتنا پیٹو گے کہ میرے ٹوٹے ہوئے استخواں کے تنگ شگافوں سے موت کا فرشتہ روح کو کھرچ کھرچ کر نکالے۔ ذرا سنو! قاتل دیکھ نہیں سکتا لیکن خنجر اندھا نہیں ہوتا۔ جب یہ سینے میں اترتا ہے تو آنکھ کھول کے زخم کو دیکھتا ہے۔ زخم کی آنکھ کھلتی ہے تو دیکھتی ہے کہ خنجر پر لگا ہوا لہو صحرا کی لُو سے بھی خشک نہیں ہوتا۔ سات سمندر کا پانی بھی اسے دھو نہیں سکتا۔ کیونکہ وقت خنجر کی دھار پر لگے ہوئے لہو سے زخم کی گہرائی ناپتا ہے۔ اور خون کی قیمت لگاتا ہے۔

''مگر یہ سایہ؟ یہ سایہ کہاں گیا؟''

وہ ہنسنے لگا:

''میں خوامخواہ واہمے میں مبتلا ہو رہا ہوں۔ یہ لوگ مجھے پولیس کے حوالے کریں گے۔ مگر پولیس؟ پولیس نے کون سا ان کے نام پرچہ دیا ہوگا جو عدالت سے ہرکارہ پروانہء حاضریِ ملزم ہاتھ میں لیکر یہاں آدھمکے گا۔ منظور احمد شاہ کو آنریبل کورٹ کے سامنے پیش کیا جائے۔ راجندر کمار شرما وغیرہ وغیرہ حاضر ہوں ہاہاہاہا........ ارے بھائی تم گمشدہ ہو اور گمشدوں کو کسی گمنام جگہ کے ویران گوشے میں پھینکا جاتا ہے۔ مشکیں کس کر، آنکھوں پر پٹی باندھ کر''۔

منظور دہشت زدہ ہو گیا۔:

''اور اگر میں بے بسی میں کتوں یا گیدڑوں کے کسی آوارہ غول کے ہتھے چڑھ گیا؟۔'' یہ کہہ کر منظور بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔

اور آدھی رات کو جب چاندنی نے چاند کے گرد ہالے کی صورت میں کنڈلی کس لی، منظور کی آنکھوں پر پٹی باندھ لی گئی اور ہاتھ پاؤں میں رسّی ڈال کر اسے لاری میں دھکیل دیا گیا۔

OOOO
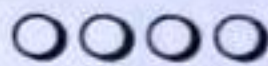
باب ششم

خون کی پچکاریاں

شہر کا ایک مضافاتی گاؤں۔ گھنے درختوں سے گھری ہوئی اس بستی پر دوپہر کا سورج چمک رہا ہے۔ بیلوں کو ہانکتے ہوئے کھیتوں میں پھٹا مارنے والے کسانوں کا چٹکارا دور دور تک گونج رہا ہے۔ کبھی کوئی چیل چوزوں پر جھپٹا مارنے کیلئے اترتی تو مرغیوں کی پھنکار سے پہلے کئی بیبیوں کی پھٹکار سنائی دیتی۔

''ہش ہش خصم موئی!''

وہ چیل کو دیر تک کوستی رہتیں۔ کبھی کسی فاختہ کی درد بھری آواز: ''اللہ ہُو'' گونجتی تو ہواؤں کی آنکھ نم ہو جاتی۔ اخروٹ اور سفیدے کی شاخوں پر کوکتی ہوئی کوئلوں کی کوک سے فضا میں عجیب ہوک اٹھتی۔ کبھی ایسا سناٹا چھا جاتا کہ گائے کے رنبھانے یا کسی بزرگ کی کھڑاؤں کی کھڑ کھڑاہٹ سے گلیاں چونک اٹھتیں۔

اس دن گاؤں کا سکول بند تھا۔ اور اس کے احاطے میں لڑکے بالے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ کچھ نوجوان بھی تھے جو سڑک سے گزرنے والی فوجی

گاڑیوں کو دیکھتے تو گھروں میں گھس کر دبک جاتے اور جب گاڑیاں گاؤں سے دور موڑ کاٹ کر نظروں سے اوجھل ہو جاتیں تو وہ سہم سہم کر نکلتے اور پھر سے کھیل میں مصروف ہو جاتے۔ کریک ڈاؤن اور پکڑ دھکڑ کے خوف سے اس گاؤں کے اکثر نوجوانوں نے قدرے محفوظ مقامات پر عارضی طور پر پناہ لی تھی۔

اچانک ایک فوجی گاڑی سڑک پر آ کر رک گئی اور کچھ فوجی جوان اتر کے سڑک کے کنارے پر دور تک بکھر گئے۔ کریک ڈاؤن کے ڈر سے کچھ لڑکے بھاگ کر ٹیکری پر چڑھ گئے اور جب ایک فوجی افسر کا قافلہ وہاں سے گزر گیا تو یہ فوجی بھی گاڑی میں سوار ہو کر وہاں سے ہٹ گئے۔

لڑکے ٹیکری سے اتر رہے تھے تو گاؤں کے ایک لڑکے توحید نے اپنے دوست مشتاق کو تنہائی میں لیکر کہا:

''معلوم ہے کل گاؤں میں مجاہد آ گئے تھے........''

مشتاق نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''کب؟ تم نے دیکھا؟''۔

توحید بولا:

''دو تھے وہ........ ایک کے منہ پر ڈھاٹا تھا۔ کلاشنکوف البتہ پھرن کے نیچے چھپا کے رکھی تھی۔ حشمت چاچا کو پوچھ رہے تھے۔ پھر چاچا کو دوسرے گاؤں اپنے ساتھ لے گئے۔ شام جب ڈھل گئی اور اندھیرا پھیلنے لگا تو چاچی پریشان ہو گئی اور لالٹین اٹھا کر چاچا کی ٹوہ میں ادھر ادھر پھرنے

لگی۔ہم سب رات گئے تک چاچی کے پاس ہی بیٹھے رہے۔آدھی رات کو کرتار چاچا نے گاڑی نکال کر چاچا کو دوسرے گاؤں سے گھر لایا۔ پتہ چلا کہ چاچا نے انہیں دوسرے گاؤں کے کسی اقبال جو کے گھر پر چھوڑا تھا اور وہ اندھیرے میں واپس لوٹنے سے ڈر رہے تھے۔''

مشتاق دانتوں سے ناخن کاٹتے ہوئے بولا:

''اگلی بار آئیں گے تو مجھے بھی بتانا۔''

توحید کو شرارت سوجھی:

''کون کرتار چاچا؟''۔

مشتاق غصہ ہو گیا:

''نہیں تمہارا باپ........ مرغی کے! میں مجاہدوں کی بات کر رہا ہوں۔''

توحید نے شانے اچکاتے ہوئے کہا:

''میں مجاہد بھی دکھاؤں گا اور کلاشنکوف بھی مگر میرے ساتھ باغ میں گیلاس (۱) کھانے آنا ہے۔''

مشتاق نے اپنا ہاتھ چھڑایا:

''نہیں نہیں مجھے انور چاچا کی گالیاں نہیں کھانی۔ نہ تمہارے کھیت سے مٹر توڑ کے صمد کاکا کی ڈانٹ۔ پچھلی بار کچے سیب تم نے توڑے تھے تو ڈانٹ مجھے پڑی تھی۔ اور جو تم لالہ کے پھول توڑ کر ان کی پتّیاں مسل مسل کر

---

cherry(۱)

ہاتھوں پر مہندی لگاتے ہو، یہ مجھے اچھا نہیں لگتا........ دادا کہتے تھے کہ خودرو لالہ بزرگوں کی دعائیں ہوتی ہیں جو رب کے دربار میں قبول ہو کر زمین پر لالہ کی جون میں واپس آجاتی ہیں۔''

توحید بولا:

''تمہارے دادا تو رب کے پاس چلے گئے، اب یہ کون بتائے گا کہ ان میں تمہارے دادا کی دعائیں کون سی ہیں۔ اچھا چلو اب۔ نہیں توڑتا........ بس؟۔ گیلاس کے پیڑ پر میں چڑھوں گا۔ مٹر میں توڑوں گا۔ احمق! جھڑبیریاں تم کھاؤ تمہاری زبان سے کانٹے میں نکالوں گا۔ تم بس باہر رہ کر پہرہ دینا اور جب میں گیلاس اور مٹر لے کر آؤں گا تم پہلے وہ کھانا۔ پھر یہ قسم کھانا کہ میں باغ میں نہیں گیا تھا اور نہ میں نے گیلاس اور مٹر توڑے ہیں۔ اچھا اب چلو بھی!''۔

جی تو مشتاق کا بھی بُھر بُھرا رہا تھا۔ وہ باڑ سے باہر ہی رہا۔ مجید نے تنے ہوئے کانٹے دار تاروں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر اتنی جگہ بنائی جہاں سے وہ اندر گھس سکتا تھا۔ گیلاس کے چکنے تنے پر دو تین بار پھسل کر آخر کار وہ پیڑ پر چڑھنے میں کامیاب ہوا۔ ابھی گیلاس پوری طرح پکے نہیں تھے۔ تھے۔ جن جن شاخوں پر گیلاس کے دانے پکنے لگے تھے مجید انہیں اپنی طرف کھینچ کر دانے توڑنے لگا۔ اچانک وہ ٹھٹھک کر رہ گیا اور یوں سکتے میں آ گیا کہ گیلاس کی گٹھلی منہ میں ہی بھول گیا۔ شاخ پر اچھی طرح پاؤں ٹکا کر وہ نیم دراز ہو کے ٹیکری کے دامن میں بہتی ہوئی ندی کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ

کر دیکھنے لگا۔ مشتاق نے حیرت سے پوچھا:

''کیوں لقوہ مار گیا کیا؟''

وہ بنا کوئی جواب دیے فوراً پیڑ سے نیچے اترا اور مشتاق کا ہاتھ پکڑ کر ٹیکری کے دہانے پر لے آیا:

''وہ دیکھتے ہو؟ وہ پلیا کے اس طرف؟ ارے اندھے اِدھر نہیں اُدھر۔ کیا ہے وہ؟''

مشتاق خوف زدہ ہو کر بولا: ''بھیّا! یہ کسی کی لاش ہے۔''

وہ بھاگنے لگا تو مجید نے پکڑ لیا:

''بھاگتے کہاں ہو؟ یہ کسی انسان کی لاش نہیں کوئی۔ کوئی جانور مرا پڑا ہے وہاں۔'' مشتاق نے اپنا ہاتھ چھڑایا:

''مجھے نہیں پڑنا کسی بکھیڑے میں۔'' اور وہ بھاگ گیا۔

اس نے پورے گاؤں میں ڈھنڈورا پیٹا۔ کچھ دیر میں گاؤں کے لوگ دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا تو کوئی کچھ۔ آخر پر گاؤں کے ایک بزرگ اسد چاچا نے کہا:

''بھئی یہاں بیٹھ کر ٹامک ٹوئیے مارنے سے اچھا ہے کہ کوئی نیچے اتر کے دیکھے کہ ماجرا کیا ہے۔''

کچھ دیر بعد کچھ جوان اسے مشکل سے کاندھے پر اٹھا کر لائے اور باغ کے ایک گوشے میں گھاس پر لٹا دیا۔ اس کے اردگرد سارا ہجوم جمع ہو گیا:

''ابے ٹنڈیاں تو کھول دو بیچارے کی۔''

''کیسے پشتو کی طرح منہ پر چھینگا باندھا ہے۔''

''گریبان میں ہاتھ ڈال کر دیکھو کہیں زنار والا تو نہیں۔''

''زنار نہیں ہے۔''

''تو کیا مسلمان ہے؟''

''نہیں سکھ ہے سکھ........ چپ پاگل کہیں کے۔''

''زندہ ہے........ سانس چل رہی ہے۔''

''کوئی مخبر ہی ہوگا........ نہیں؟۔''

''ستیاناس ہو تمہارا........ بے وقوف۔''

''اٹھا کر یعقوب چاچا کے گھر لے آؤ۔''

''سنبھل کر زخمی ہے بیچارہ........ کہیں مر مرا گیا تو۔''

''تمہاری زبان میں کیڑے پڑیں........ منحوس!''

یعقوب چاچا کے صحن میں بھیڑ جمع ہوگئی۔ عورتیں سینہ پیٹ رہی تھیں:

''ہائے کیسے گبرو جوان کو توم کے رکھا ہے........ ہے ہے! کیسے جوانِ رعنا کو قصائیوں نے زخمی کر کے مرنے کے قریب پہنچایا ہے۔ ہائے نصیب نے بیچارے کو کن ظالموں کے پالے ڈالا۔''

سردار کرتار سنگھ

کرتار سنگھ کی پوتی نے پھاٹک پر دستک سنی تو بغلی دروازے کے رخنے سے جھانک کر عبدالصمد بٹ سے توتلی زبان میں کہا:

’’انکل جی! انکل جی!! دادا جی ناند پر مرغا صاف کر رہے ہیں‘‘۔

پھر وہ چلّا کر بولی: ’’دادا جی! دادا جی!! صمد انکل آئے ہیں۔‘‘

کرتار سنگھ کی گھر والی ہرپریت کور الگنی پر گیلے کپڑے ڈال رہی تھی۔ اس نے آواز سنی تو فوراً سر پر دوپٹہ ڈال کر دروازہ کھولا:

’’آداب۔‘‘ علیک سلیک کے بعد اس نے سردار جی کو پکارا:

’’سردار جی! صمد بھائی۔‘‘

کرتار سنگھ باہر نکلے تو ان کی خونم خون قمیص دیکھ کر ہرپریت بولی:

’’بھائی صاحب! رب نے سردار جی کو بہت کچھ دیا۔ زمین، جائیداد، گاڑی بنگلہ سب کچھ‘‘۔ پھر اس نے کرتار سنگھ کی قمیص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ’’بس ذرا سی عقل دینا بھول گیا، یا شاید بانٹ رہا تھا تو سردار جی کہیں سوئے پڑے تھے۔‘‘

اس پر صمد بٹ نے قہقہہ مارا۔ سردار جی بولے:

’’او، اڑاؤ اڑاؤ مذاق سردار کا........ اب صمد بھائی بھلا تم ہی بتاؤ میں اس عمر میں بہو بیٹیوں کے ہوتے کپڑے اتار کے خالی لنگوٹ اور بنڈی میں مرغا کاٹ کر صاف کرنے بیٹھوں۔‘‘

پھر وہ بیوی سے بولے: ’’ہرپریتے! میرے بھائی کو کھڑے کھڑے ہی میرے خلاف بھڑکاؤ گی یا صحن میں کرسیاں لگا کر چاء بھی پلاؤ گی۔‘‘

یہ سن کر بچوں نے جو آنگن میں کھیل رہے تھے دو کرسیاں کھینچ کر ایک طرف سبزے پر چھاؤں میں لگا دیں۔ ہرپریت اندر چائے بنانے گئی۔

سردار جی کرسی پر بیٹھ گئے، کہنے لگے:

''مرغا ذرا سا جھٹپٹایا اور کرتے پر خون کا یہ چھینٹا لگ گیا۔ مگر یہ بہانہ ہے........ غصّہ تمہاری بھابی کو کسی اور بات پر ہے۔''

بٹ نے پوچھا: ''کس بات پر ناراض کر دیا بیچاری کو۔''

سردار جی نے لمبی سانس بھر لی: ''یار! دنیا میں انسانیت کوئی چیز ہے کہ نہیں؟''

''کیا مطلب؟'' بٹ نے حیرانی سے پوچھا۔

سردار جی بولے: ''او مطبل میں سمجھاتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ عیش پور کے مَلِکوں سے ہمارے خاندان کے پرانے تعلقات ہیں۔ دو دن پہلے سرفراز مَلِک کے جوان پوتے دلنواز مَلِک کی لاش آئی سرحد سے۔ میں گیا تھا تعزیت کے لئے۔ بس اسی بات پر بھڑک اٹھی۔ سرفراز مَلِک کا ہمارے خاندان پر بڑا احسان ہے۔ میرے باؤ جی کہتے تھے کہ جب قبائیلوں نے ریڈ کی اور سکھوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے کاٹنے لگے تو آپا دھاپی کے اس دور میں سرفراز مَلِک کے بابا نے میرے دادا کو کہیں چھپا کے رکھا۔ قبائیلوں کو پکّی خبر تھی کہ مَلِک صاحب نے مکھن سنگھ کو کہیں چھپا کے رکھا ہے۔ کئی دن کے زدوکوب کے باوجود اس نیک بزرگ نے زبان نہیں کھولی۔ کئی دفعہ بندوق سینے پر تان کر جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی........ مگر''

ہرپریت نے چائے کی دو پیالیاں میز پر رکھ دیں اور اپنے لئے کرسی لا کر درمیان میں بیٹھ گئی۔ بولی:

''لیجئے بھائی صاحب! ان کی کتھا سنیں گے تو چاء ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

صمد بٹ نے چائے کی پیالی اٹھا کر پوچھا۔:

''تو کیا کہہ رہے تھے تم؟۔'' سردار جی نے چائے کی چسکی لی۔:

''او ہاں........ میں کہہ رہا تھا کہ اگر اس وقت سمندر مِلک وہ احسان نہ کرتے تو اتنا بڑا اٹبر کہاں سے پیدا ہوتا؟۔'' ہر پریت بیچ میں بولی:

''ہاں صحیح ہے۔ مگر بھائی صاحب! اب حالات بدل گئے ہیں۔''

یہ سنکر سردار کو تاؤ آ گیا۔:

''او حالات بدل گئے ہیں انسان تو نہیں بدل گئے۔ رشتے تو نہیں بدل گئے۔ او آسمان پر لاکھ کالا رنگ چھائے دودھ کا رنگ سفید ہی رہے گا۔ انسان کی چمڑی رنگ بدل سکتی ہے۔ مگر خون اپنا رنگ نہیں بدل سکتا...... ایسے ہی بے فضول بات کرتی ہے۔''

ہر پریت بھانپ گئی کہ سردار جی کے تیور بدل گئے۔ اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔:

''اچھا بھائی صاحب! اس زخمی نوجوان کو ہوش آ گیا؟ کچھ پتہ چلا کہ کون ہے۔ کہاں کا ہے اور ان حالوں کیسے پہنچ گیا؟۔''

صمد بٹ نے چائے کی خالی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔:

''ہاں بھابی! ہوش میں آ کر اس نے سب بتا دیا۔ منظور احمد شاہ نام ہے۔ انٹروگیشن سے چھوٹ کر آیا ہے۔ سرینگر کے حبہ کدل علاقے کا رہنے والا ہے۔

یہ سن کر سردار جی اچھل پڑے۔:

''کہیں یہ شاہ صاحب کا وہی بیٹا تو نہیں جو لا پتہ ہے۔''

صمد بٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔:''اور کیا........ وہی تو ہے۔''

سردار جی خوش ہو کر بولے۔:''او تیری بلے بلے یہ تو اپنا منڈا ہے۔ ہر پریت! کیا بتاؤں اس کا باپ بڑا نیک آدمی ہے او وہی جن کے یہاں ہم کیا بولتے ہیں اسکو''

بٹ نے لقمہ دیا:''بیت المال۔''سردار جی نے بات پوری کر دی۔:

''ہاں جی ہاں بیت المال کے لئے خیرات کا سامان چھوڑتے ہیں۔''

ہر پریت نے پیالیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔:

''رب بھلا کرے۔ جانے اور کیا کیا دیکھنا ہوگا۔''

ہر پریت چلی گئی تو صمد بٹ نے سردار جی سے کہا۔:

''........ یار کرتارے! تم اپنی گاڑی نکالتے تو اس بیچارے کو اسپتال پہنچاتے۔ دو دفعہ تمہاری بھابی نے دودھ پلایا دونوں دفعہ الٹی کر دی۔ بدن بخار سے تپ رہا ہے۔''

یہ سُن کر کرتار سنگھ بے چین ہو گئے، اور ماتھے پر تیوری چڑھا کر بولے۔

''او! کس اسپتال کی بات کر رہے ہو تم؟ قصائی خانہ ہے قصائی خانہ۔ گیا تھا میں آج بی جی کا نسخہ لیکر ڈاکٹر کو دکھانے۔ بڑی ہڑ دھنگ مچی تھی۔ اندر جاتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ کوئی بکھیڑا ضرور ہے۔ پوچھا تو کسی نے بولا نہیں۔ دیکھا کہ جس کمرے میں ڈاکٹر معائنہ کرتے ہیں اس کے چاروں

طرف بھیڑ جمع ہے۔لوگ کھڑکیوں کے شیشوں سے اندر جھانک رہے ہیں۔کیا دیکھتا ہوں کہ بیڈ پر دونو جوان پڑے ہیں اور دونوں کے جسموں سے رستا ہوا خون فرش پر ٹپ ٹپ گر رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر ایک نو جوان بڑی درد بھری آواز میں بولا۔:

''سردار جی! آپ کو سچے بادشاہ کی قسم ہمیں بچایئے۔''

یہ سن کر میرا سر چکرا گیا۔دروازہ کھولنا چاہا۔دیکھا کہ اس پر تالا چڑھا ہے۔ایک پتھر راستے سے اٹھا کر لایا اور جو بولے سونہال ست سری اکال کا نعرہ مار کر تالے پر دے مارا۔بھیڑ میں سے کریم خان نکلا۔میری باہ پکڑ کر مجھے کلے میں (تخلیہ میں) لے گیا اور کہا:

''کرتارے!ہوش میں آؤ۔یہ کیا کر رہے ہو۔ان دونوں کو فوجی اپنی گاڑی میں لائے ہیں۔رب جانے کون ہیں۔ڈاکٹر ڈر کے مارے بھاگ گئے۔تم اپنی جان کو کیوں جوکھم میں ڈال رہے ہو چلو یہاں سے....... ست گورو تیری اوٹ۔ پتہ نہیں اس دھرتی کا کیا ہوگا؟ صمد بھائی میری مانو تو اسے شہر ہی لے چلتے ہیں۔اس کے گھر والوں کو بھی تسلی ہو گی۔''

یہ کہہ کر سردار جی نے ہر پریت کو آواز دی:

''ہر پریتے!میرا سفید کرتا شلوار نکال دو۔''

صمد بٹ متفکر ہو کر بولے۔:

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔مگر یہ نہ بھولو کہ راستے میں کیمپ بھی ہے۔جامہ تلاشی ہوتی ہے۔میں نہیں چاہتا کہ یہ بیچارہ کسی اور اجگر کے منہ

میں چلا جائے۔''

سردار جی نے بٹ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا:

''او! جنوں رب رکھے انوں کونڈ چکھے۔ فکر مت کرو۔ کرتار سنگھ کس مرض کی دوا ہے۔ تم بس خالدہ بیٹی کو تیار رکھو۔۔۔۔۔۔۔ راستے میں جانچ پڑتال ہوئی تو کہہ دوں گا کہ میرے دوست کا داماد ہے، کچھ دن پہلے ٹیکری سے گر کر زخمی ہوا۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر میرا یار ستونت سنگھ بھی تو اسی کیمپ میں ہے۔ پھر کس دن کام آئے گا۔ تم تیاری کر لو میں بس ابھی پہنچا۔''

یہ کہہ کر سردار جی اندر چلے گئے۔

۔۔۔۔۔۔۔ سرینگر کے صدر اسپتال کی تعمیر کے وقت خون پسینہ بہانے والے نانِ شبینہ کے لئے ترستے کشمیری مسلمانوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک ان کی نسل وہ ہوگی جس کے گرم خون کی پچکاریوں سے اس اسپتال کا فرش شفقی ہو جائے گا اور جس کے کوڑے دان پیلے اور سرد جسموں پر چپکی ہوئی دھجیوں اور ان سے نکالی گئی گولیوں سے بھر جائیں گے اور جسم اس قدر پھٹ جائیں گے کہ ان پر ٹانکے لگانے کے لئے سات سمندر کی لمبائی کا دھاگا بھی کم پڑ جائے گا۔ اور کتنے سینوں میں گرنیڈوں کے چھرے سرد ہو کر ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائیں گے۔ اور انسانی جسموں کے اندرونی اعضاء کو توم کر رکھنے والی گولیوں کا سراغ لگانے کے لئے ان پر چیرہ لگانے والے بچھنے اور زخموں کو

ٹانکنے والی ہلالی سوئیاں کند ہو جائیں گی۔

عصر کی اذان ہو رہی تھی کہ کرتار سنگھ کی موٹر کار ایمر جنسی کے احاطے میں آ کر رک گئی۔ صمد بٹ نے کار سے اتر کے اپنی دونوں باہیں منظور کی طرف پھیلائیں۔ نورالدّین نے جھک کر بیٹے کو سہارا دیا۔ جھکتے وقت ان کی ٹوپی ترچھی ہو گئی۔ ایمر جنسی وارڈ میں اسٹریچر پر دراز ہوتے ہی منظور کو لگا جیسے اس کی کنپٹی کی رگ پھڑک اٹھی اور اس کی توجہ اپنی ذات سے ہٹ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی طرف دیکھتی ہوئیں آنکھیں وہ بجھے ہوئے چراغ ہیں جن سے دھوئیں کی لکیریں اٹھ رہی ہیں۔ پھر اچانک آوازیں خاموشی کی فضا میں تیرتے تیرتے گونگی ہو گئیں۔ کھڑکی کے شیشوں کے اس پار سارے منظر عکس سے ماورا ہو گئے۔ اسے لگا جیسے نیند کا ایک ٹوٹا ہوا لمحہ وقت کی پلیا کے نیچے بہتی ندی کے دھاروں کو جوڑنے کی کوشش کر رہا ہے اور ایک بے رحم سکوت میں نئی فنا تخلیق ہونے لگی ہے۔

ڈاکٹر نے اسٹیتھسکوپ اس کے دل کی جگہ پر رکھی۔ اچانک ٹھنڈک کے احساس سے اس کے دل کی دھڑکن تھرّا گئی۔ ڈاکٹر نے گھبراتے ہوئے نرس سے کہا:

"سسٹر!........ آکسیجن پلیز فوراً۔"

اور وہ فائیل پر کچھ لکھنے لگا۔

پھر خوف و دہشت کا ایک مٹیالا پل ساری فضا پر چھا گیا اور باہر لاری سے فائرنگ میں زخمی ہونے والے ان احتجاجی نوجوانوں کو اتارا گیا جن کے سینوں

میں گولیاں چیخ رہی تھیں۔ جن کے پیلے جسموں سے بہتے ہوئے لہو پر مدد کے لئے دوڑنے والوں کے جوتے بے رحمی سے پڑ رہے تھے........ جن کے سینوں کی چیر پھاڑ کے لئے ڈاکٹروں نے آپریشن تھیٹر کے دروازے کھول دئے۔ ہاتھوں پر دستانے اور منہ پر نقابیں چڑھائیں۔

باہر ایک کربلا برپا تھا۔ کچھ ماؤں کی اوڑھنیاں ان کے لاڈلوں کے زخموں کے ساتھ گئی تھیں اور کچھ اپنی اوڑھنیوں کو آسمان کی طرف پھیلا کر کائنات بنانے والے سے سوال کر رہی تھیں:

''ہمارے گبرو جوانوں کی حفاظت کرنا........ مولا!''۔

کوئی بی بی دوہتڑ اپنے منہ پر مارتی .... کوئی بالوں سے جھاڑو دیتی۔ کوئی گریبان پھاڑ کے سینہ کوٹتی........ کوئی منہ پر اپنے لال کا خون ملتی .... خدا سے اپنے وارث کی زندگی کے لئے دعا کرتی۔

اور کرتار سنگھ نے جب ایک لاوارث زخمی نوجوان کو گود میں بھر لیا تو وہ جھٹپٹا کر جاں بحق ہوا۔ کرتار سنگھ کا سفید براق کرتا خونم خون ہو گیا اور ان کی لمبی سفید ڈاڑھی سے دیر تک خون کے قطرے ٹپکتے رہے۔ کرتار سنگھ کو لگا جیسے ان کا وجود ٹھنڈی ریت ہے جس پر شام کی سلگتی ہوائیں تیر رہی ہیں۔ جیسے ان کے جسم کے آر پار اس نوجون کا سایہ منڈلا رہا ہے:

''او پتر! مجھے نہیں معلوم تو کس مائی کی گود کا پالا ہے۔ تجھے میری ہی گود میں جھٹپٹا کر........''

وہ دھاڑتے ہوئے رونے لگے۔

پھر وارڈ میں جیسے منظور کی کنپٹی کی دھڑکن سرد ہوگئی اور سانسیں اس کے وجود کے دھاگوں سے تانا بانا بننے لگیں۔ چراغ پھر سے جلنے لگے اور فضا دھویں سے پاک ہوگئی۔ آوازیں خاموشی کی دہلیز سے جستہ جستہ اتر کے چلنے لگیں اور کھڑکیوں کے اس پار چنار کے پتّے سرسرانے لگے۔ وقت کے دھارے مل گئے اور آوازوں کی گود میں ایک نیا وجود جنم لینے لگا۔ اس کی رگوں میں خون کی بوتل سے سانپ کی طرح لہراتی ہوئی پہلی بوندیں اتر گئیں تو آکسیجن ماسک پر اس کی سانسوں کی دھند دیکھ کر نورالدّین شاہ کی جبین میں ایک شکن دھڑک اٹھی:

''بچ جائے گا........ میرا بیٹا بچ جائے گا۔''

ٹھیک اسی وقت کرتار سنگھ برآمدے میں پاؤں پھیلائے بڑبڑا رہے تھے:

''او مرنا ہے۔ جب سب کو مرنا ہے تو چنار کے پتّے کیوں سرسرا رہے ہیں۔ او جہلم کی لہریں سوکھ گئی ہیں۔ موسم میں زہریلے گردوغبار کے ساتھ خون کی بُو مل گئی ہے جو خواب جیسے بوٹوں کو چھو کر ان کی شاخوں کو کاٹھ اور پتّوں کو چُرمُر بنا رہی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تو کس مائی کی گود کا پالا تھا مگر پتر! تجھے میری ہی گود میں۔ ہر پریت! سچ کہتی ہو تم۔ رب نے مجھے سب کچھ دیدیا ہے بس ذرا سی....... یا پھر وہ بانٹ رہا تھا اور میں''۔

صمد بٹ نے سردار جی کو گلے لگا کر تسلی دی۔ کرتار سنگھ نے اپنا خون سے لتھڑا ہوا کرتا دکھایا۔ پھر وہ روتے ہوئے اپنی لمبی سفید ڈاڑھی میں خلال کرنے لگے جس پر خون جم گیا تھا۔ انہیں ڈاڑھی کا ہر بال نشتر لگنے لگا جوان کے سینے کو چھلنی کر رہا تھا۔

........اور جب اپنے بیٹے کی سلامتی کے ساتھ بازیابی کے لئے تین رتجگوں کی منت مانگنے والی ماں کے مرجھائے ہوئے ماتھے پر اس کے چھوٹے بیٹے فاروق احمد نے اپنی ہتھیلی رکھ دی تو اسے لگا جیسے فاروق کی آنکھوں میں آس کے جلتے چراغوں سے اس کے ہونٹوں پر ایک کرن چونک کر جاگ اٹھی۔ یکا یک شیخ حمزہ مخدومیؒ (۱) کے آستان کی دہلیز کا مقدس پتھر جھلملانے لگا۔ ماں نے اوڑھنی فرش سے اٹھا کر جو روزن سے باہر دیکھا تو اسے لگا جیسے اس درگاہ سے گجر بج گیا اور سارا شہر تہہ بہ تہہ جاگنے لگا۔ شیخ حمزہ مخدومیؒ کی درگاہ میں مغرب کی اذان ہوگئی تو ماں نے سجدے میں سر جھکایا اور اپنے مولا کا شکر ادا کیا۔

شام ہاری پربت کی خستہ منڈیروں سے اتر کے شہر میں تحلیل ہو رہی تھی۔ سارا شہر ٹمٹما رہا تھا۔

اور جب منظور احمد کو اچھی طرح ہوش آیا تو وہ چہروں کی بھیڑ میں اپنوں کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر وارڈ کے شوروغل میں اس کے خیالات کہیں گم

---

(۱) ۱۶ ویں صدی عیسوی کے ایک عظیم روحانی بزرگ

ہو گئے۔ وہ سوچنے لگا: ''کیا چٹر جی کے جانے کے بعد میرا پھر سے انٹروگیشن ہوا تھا؟ مجھے نیم مردہ حالت میں کب اور کیسے پھینکا گیا؟''

وارڈ میں طوفان برپا تھا جس کے شور میں زخم کھائے ہوئے لوگوں کی دردانگیز چیخیں اپنی شناخت کھو رہی تھیں۔ منظور کچھ سوچنا چاہتا تھا جس کے لئے اسے خاموشی کی ضرورت تھی۔ ہوا میں، فضا میں، چہروں میں، ذہن میں۔ وہ ایسا سناٹا چاہتا تھا جس میں چڑیوں کی چہکار شاخوں سے شرماتی ہوئی اترتی۔ وہ اپنے گھر کی کھڑکی کھول کر سورج کو اگتے ہوئے، شہر کو جاگتے ہوئے اور سڑکوں کو سانس لیتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔

اور جب ماں کی چوڑیوں نے اس کے ماتھے کو چھوا تو اسے لگا جیسے زندگی ہرا لباس پہن کر ماں کی سوجی ہوئی آنکھوں سے زینہ زینہ اتر رہی ہے:

''امّی!''

آکسیجن کی ماسک پھر سے دھندلا گئی۔

''مولا سب ٹھیک کر دے گا۔''

نورالدّین شاہ نے بیگم کو دلاسا دیا۔ سارا بیگم نے اوڑھنی کے ایک کنارے میں منت کی گانٹھ باندھ لی اور دوسرے کنارے سے آنسو پونچھ لئے۔

اور جب نورالدّین کے گھر پہنچ کر سردار جی نے فاروق احمد کا خان ڈریس پہن لیا تو اپنے خونم خون کپڑے دیکھ کر انہیں لگا جیسے انہوں نے اس نوجوان کا خون آلودہ کفن چرایا ہو۔ انہیں جھرجھری آئی۔ خالدہ کو تو شاہ کی بیگم اور ان کی

اکلوتی بیٹی شمع نے روکا کہ یہ ایک نوجوان کنواری لڑکی کے سفر کرنے کا وقت نہیں تھا البتہ صمد بٹ اور کرتار سنگھ روانہ ہو گئے۔ کرتار سنگھ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہیڈ لائیٹس کی دودودھیا لکیریں دھند میں چھید کرتی ہوئیں کہیں کھو گئیں۔

باہر بہت اندھیرا اپھیل چکا تھا۔

OOOO

باب ہفتم

کریک ڈاؤن

وہ ایک امس بھرا دن تھا۔دو پہر کو لگا جیسے چھتوں کی ٹین پگھل پگھل کر ٹپکنے لگے گی۔گلیوں میں اکثر دکاندار اونگھ رہے تھے۔کبھی کبھی کسی آٹو رکھشا یا ٹیکسی کے گزرنے سے خاموشی ٹوٹ جاتی اور کوئی دکاندار چونک کر جاگ جاتا۔سورج ڈوبا تو نرم نرم ہوائیں چلنے لگیں جو جہلم کے آنچل کو چھو کے آرہی تھیں۔ایسے میں لوگ اپنے گھروں سے نکل کر یا تو گلیوں میں گھومتے یا پھر دکانوں کے تھڑوں پر گپیں ہانکتے۔اُس دن ایسا کچھ نہیں ہوا۔مغرب سے پہلے ایک عجیب قسم کی نحوست بھری سنسنی چھا گئی۔قبرستان جیسا سناٹا پسارا۔ایسا لگ رہا تھا کہ پورے علاقے میں منحوس سائے پھیلنے لگے اور چاروں طرف بستی کو بھیانک پہاڑوں نے حصار میں لے لیا اور ہر طرف سے ''یا اخی! یا اخی!'' کی ہیبت ناک صدائیں آرہی ہیں۔

مغرب کی نماز سے پہلے ہی سب دکانیں بند ہو گئیں۔گلیوں اور کوچوں میں جیسے بدروحیں منڈلا رہی تھیں۔خواجہ احمد قدوس دیوان خانے میں ریڈیو آن کر کے خبریں سن رہے تھے کہ زینت بیگم ان کے لئے شربت لے کر

آئیں۔ زینت بیگم نے ریڈیو بند کر دیا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ان کی یہ حرکت خواجہ پر ناگوار گزری زینت بیگم نے تیوری چڑھا کر کہا:

''کچھ گھر بار کی خبر بھی ہے آپ کو؟''

خواجہ نے شربت کا گھونٹ پی کر پوچھا:

''کیوں کیا ہوا؟''

''ستیاناس اور کیا۔'' زینت بیگم نے غصّے سے جواب دیا۔

خواجہ کے منہ پر جیسے کسی نے اچانک تھپّڑ مار دیا۔ وہ کچھ لمحوں کے لئے جھجکے مگر فوراً ہی خود کو سنبھالا۔

''بات کیا ہے آخر؟''۔

زینت بیگم اُبل پڑیں:

''دیکھئے جی! یہ رمضان حجام کے بیٹے الطاف کو یہاں رکھ کر آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اس پر مقبول خان کا بھتیجا...... یہ میرا گھر ہے کوئی ہائیڈ آوٹ نہیں۔ آخر میں ماں ہوں۔ گھر میں جوان بیٹی ہے۔ آپ یہ جانتے ہوئے کہ یہ دونوں تربیت یافتہ ہیں......''

خواجہ نے ہاتھ اٹھا کر بیگم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے:

''بیگم سمجھا کرو۔ اب اس میں برائی کیا ہے؟ رمضان کے گھر پر پے در پے چھاپے پڑنے لگے۔ الطاف کی ڈھنڈیا میں ملٹری سرگرم ہے۔ رمضان نے پاؤں پکڑ کے کہا کہ سرکار! شبانہ چھاپے کے دوران آفیسر نے میری جوان

بیٹی نرگس کی باہ پکڑ کر اسے ساتھ لینے کی کوشش کی تھی۔نورا نے آفیسر کے پاؤں پکڑ کر بیٹی کو چنگال سے بچایا۔آفیسر دھمکی دے کے گیا ہے کہ اگر الطاف کو پیش نہ کیا تو نرگس کو لے کر جائے گا........ نرگس کو تو بیچارے نے سوپور میں اپنے رشتہ داروں کے یہاں ٹھکانے لگایا۔خود میاں بیوی ہجرت کر کے دکان کے اوپر والے کمرے میں گزارہ کر رہے ہیں........ آخر الطاف مجاہد ہے۔اس نے اس قوم کی آزادی کے لئے ہتھیار اٹھائے ہیں۔"

زینت بیگم مطمین نہ ہوئیں بلکہ ان کا پارہ اور چڑھ گیا:

"چولھے میں جائے یہ قوم اور یہ مجاہد........"

یہ سنکر خواجہ غصّے سے لال پیلا ہو گئے:

"زینت بیگم! تم حد سے گزر رہی ہو"۔

زینت کا لہجہ اور ترش ہو گیا:

"کیوں نہ گزر جاؤں........ آپ کو پتہ ہے کہ یہ حجام کی اولاد وقت بے وقت بے تحاشا نائیلہ کے کمرے میں جا کر اس سے گپیں ہانکنے کی کوشش کرتا ہے۔میں پاؤں کی جوتی کو سر پر نہیں رکھ سکتی۔"

خواجہ معاملے کی نزاکت کو سمجھ گئے۔لہجہ نرم کر کے بولے:

"زینت! تمہیں خدا کا واسطہ ابھی اس بارے میں خاموش رہو۔میں الطاف کو خود ہی سمجھاؤں گا۔آخر کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے "نظم" (ا) والے

(ا) نظم سے مراد عسکری تنظیم

اسے کسی اور علاقے میں بھیج رہے ہیں...... رہی بات مقبول کے بھتیجے کی تو اس کا زخم ٹھیک ہوتے ہی اسے روانہ کیا جائے گا۔"

زینت بیگم کا غصہ کسی حد تک کم ہو گیا مگر رکھائی سے بولیں:

"دیکھئے جی! میرے گھر کو اس معاملے میں نہ گھسیٹئے۔ میں نے بولا تھا اس موئے الطاف کو ملٹری پر بے تحاشا حملے کرنے کو۔ وہ بھی تو مارے جاتے ہیں۔ ان کے گھروں میں بھی تو جوان بیٹوں کے جنازے اٹھتے ہیں۔ وہ کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے تماشا دیکھیں گے...... اور اس خان زادے کو سرحد پر گولی لگی ہے اس کا بھی ٹھیکہ میں نے ہی لیا ہے۔"

خواجہ نے اپنی بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"زینت! الطاف کو بندوق چڑیاں مارنے کے لئے نہیں دی گئی ہے۔ وہ مجاہد ہے کوئی چڑی مار نہیں کہ دن بھر بندوق کاندھے پر رکھ کے چڑیاں مارتا پھرے۔ کیوں کوس رہی ہو بچارے کو۔"

یہ سن کر زینت بیگم جل بھن کر اٹھیں۔ پھر رسوئی سے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ زینت اپنا غصہ حبیب اللہ پر اتار رہی تھیں۔ خواجہ مسکرائے:

"زینت بھی کمال کی چیز ہے...... پھر کی ہے پھر کی۔"

خواجہ بی۔ بی۔ سی لندن کی اردو نشریات سے خبریں سن رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی:

"خواجہ صاحب! سلام علیکم"...... دوسری طرف نورالدین شاہ

تھے۔خواجہ ذرا سا گھبرائے کہ ابھی تو مسجد میں ملے تھے۔اتنی ہی دیر میں ایسی کیا بات ہوئی کہ فون کرنے کی ضرورت پیش آئی۔انہوں نے سنبھل کر کہا:

''وعلیکم۔شاہ صاحب خیریت ہے؟''

نورالدّین گھبرائے ہوئے تھے:

''خیریت نہیں ہے شاہ صاحب۔دومنٹ بات ہوسکتی ہے؟''

خواجہ ایک دم پریشان ہوگئے۔بولے:

''ہاں ہاں تشریف لائیے۔''

........جب تک نورالدّین آئے تب تک خواجہ عجیب ادھیڑ بن میں مبتلا رہے۔اور جب شاہ نے ان سے کہا کہ افواہ گرم ہے کہ کل اس علاقے میں کریک ڈاؤن ہوگا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔نورالدّین کے چہرے پر پہلے سے ہی ہوائیں اڑ رہی تھیں خواجہ کو اس قدر حواس باختہ دیکھ کر زیادہ ہڑ بڑائے۔خواجہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا:

''تو کیا کرنا چاہئے؟۔''

شاہ نے اضطراب میں ڈاڑھی کھجاتے ہوئے کہا:

''مجھے تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا ہے۔شام سے پہلے ہی علاقہ میں منحوس سائے گشت کر رہے تھے۔میرا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا۔اکثر جوان تو بستی چھوڑ کر گئے........میں نے سوچا کہ منظور اور فاروق کو کسی محفوظ مقام پر بھیجنے سے پہلے آپ سے مشورہ کروں۔بہت تشویش ہورہی ہے۔''

خواجہ یہ سنکر متفکر ہوگئے مگر اس وقت انہیں کوئی فیصلہ لینا ضروری تھا۔اور

اس کے لئے ہمّت کی ضرورت تھی سو انہوں نے اپنی ساری ہمّت جٹا کر شاہ سے کہا:

''شاہ صاحب! تشویش کی بات ضرور ہے۔اور پھر آپ جانتے ہیں کہ ہمارے سرونٹ کوارٹر میں اس وقت رمضان کا بیٹا اور مقبول کا بھتیجا روپوش ہیں۔یہ وقت ہمّت ہارنے کا نہیں۔آپ یوں کیجئے ایک آدھ گھنٹے کے بعد منظور اور فاروق کو یہیں لے کر آیئے۔''

یہ سن کر شاہ مزید تشویش میں مبتلا ہو گئے:

''مگر یہاں چھپنے کی کون سی جگہ ہے؟''

خواجہ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''ماسٹر ترلوک ناتھ کا مکان۔باقی اللہ نگہبان ہے۔''

خواجہ اور ان کی بیگم تہجد پڑھ رہے تھے کہ مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوا:

''حضرات! حضرات!! حضرات!!! فوج نے اس بستی کو محاصرے میں لیا ہے۔بستی والوں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ فجر کی نماز گھروں میں ہی ادا کریں اور نماز کے فوراً بعد مرد اسکول کے میدان اور خواتین جنازہ گاہ میں جمع ہو جائیں...... مزید یہ انتباہ کیا جاتا ہے کہ اگر خانہ تلاشی کے دوران کوئی فردِ بشر گھر میں پایا گیا تو اُسے موقعہ پر ہی گولی ماردی جائے گی۔''

صبح کا دھندلکا پھیلا تو مکین اپنے مکانوں سے جوق در جوق نکلنا شروع

ہوئے۔ بستی کے ہر نکڑ پر فوجی گاڑی کھڑی تھی۔ گلیوں میں فوجی جوان چست و چابکدست پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کے لباس اور ہتھیاروں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے جنگ چھڑ گئی ہے۔ ان کی خشم آلودہ نگاہیں دیکھ کر لوگ تیز قدم اٹھاتے میدان کی طرف روانہ ہونے لگے۔ کوئی تساہل کرتا تو اسے گالیاں دے کر ڈنڈے مار کر ہانکا جاتا۔

اسکول کے میدان میں سب مرد جمع ہو گئے تو انہیں صفوں میں رکھ کر اکڑوں بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ میدان کے چاروں طرف فوجی جوان ہتھیاروں سے لیس پہرے پر کھڑے تھے۔ کوئی نو بجے کا عمل تھا کہ ایک فوجی آفیسر آ کے مجمعے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پہلے اس نے ایک طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ مجمع پر نظر ڈالی۔ پھر گلا کھنکار کر آواز اونچی کر کے بولا:

''بھارت ماتا کی۔''

سامنے سناٹا چھایا تھا۔ ایسا سناٹا کہ اسکول کی چھت پر بیٹھے کبوتروں کی غٹرغوں اس قدر صاف سنائی دی جیسے وہ آفیسر کے شانوں پر بغبغاتے ہوئے بول رہے تھے۔ اس نے اپنی طنزیہ مسکراہٹ کو اور گہرا کر کے آگے کھڑے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ سپاہیوں نے اشارہ پاتے ہی ہوا میں گولیوں کے کئی راؤنڈ چلائے۔ درختوں کی شاخوں پر بیٹھے پرندے اڑ گئے۔ ادھر خواتین نے گولیوں کی آواز سن کر محاصر کو توڑنے کی کوشش کی۔ وہ ڈر گئیں کہ شاید مردوں پر گولیاں چلائی جا رہی ہیں۔ انہوں نے تہلکہ مچایا۔

اب آفیسر کے چہرے پر تناؤ محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''اب اگر مجھے نعرے کا جواب نہیں ملا تو پیڑوں سے پتے نہیں گریں گے زمین پر تمہاری لاشیں گریں گی:

''بھارت ماتا کی''

''جے''

''ہندوستان''

''زندہ باد''

''ہاں اب ٹھیک ہے۔'' اور وہ ٹین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس نے غائر نظروں سے مجمعے کا مشاہدہ کرنا شروع کیا۔ اس کی نظریں خاص کر نوجوانوں کی نظروں کو چھید کر گزر رہی تھیں۔ پھر وہ کرسی سے یکا یک اٹھا اور اپنی چھڑی سے داہنی ہتھیلی کو ہلکے ہلکے تھپتھپانے لگا۔ وہ مجمعے سے مخاطب ہوا:

''دوستو! میرا نام دھیرج کمار ہے۔ میں نئی دہلی کا رہنے والا ہوں۔ میری پہلی پوسٹنگ کشمیر میں ہی ہوئی تھی۔ تب یہ شانتی ون تھا۔ اب اسے کچھ لوگوں نے نرگ بنا دیا ہے۔ میرے کچھ دوست یہاں تھے جو میرے گھر آتے تھے جن کے گھر میں جاتا تھا۔ بھائی چارہ تھا۔ اب وہ مجھے ملنے سے ڈرتے ہیں اور ظاہر ہے میں بھی ان سے دور رہنا چاہتا ہوں........ ایک بات میں ایمان سے کہتا ہوں وہ یہ کہ مجھے آج تک کشمیری قوم کا کریکٹر سمجھ میں نہیں آیا۔ جب ہم آپ کے مجاہدوں کی تلاش میں کسی بستی میں جاتے ہیں تو بستی والے انہیں گالیاں دے کر ہمارا سواگت کرتے ہیں اور ان کے خلاف

شکایتیں کرتے ہیں کہ وہ ہمارے گھروں میں زبردستی گھستے ہیں۔ پیسہ مانگتے ہیں۔ بہو بیٹیوں کو بری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ اور جب وہ آتے ہیں تو ہماری شکایتوں کا دفتر کھولتے ہیں۔ فوجیوں نے مار پیٹ کی۔ جوانوں کا انٹروگیشن کیا۔ عورتوں کے ساتھ بدتمیزی کی۔ آپ لوگ ہمارے مسیحا ہو۔ ہم آپ کے لئے اپنا خون دیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگ کس کے ساتھ ہو۔ یا تو ان کا پورا ساتھ دو۔ خون بہاؤ اور آزاد ہو جاؤ۔ یا پھر ہمارا ساتھ دو ہم آپ کو ان سے نجات دلائیں گے۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ ابھی ابتدا ہے۔ اس سے پہلے کہ کشمیر پوری طرح رن بھومی میں بدل جائے فیصلہ کرلو........ جے ہند"۔

یہ سب کہہ کے وہ چلا گیا۔ پھر کتر بیونت کا عمل شروع ہوا اور چن چن کے نوجوانوں اور مشتبہ افراد کو اسکول کے ایک کمرے میں قائم کئے گئے تعذیب خانے کی طرف لیا گیا۔ جہاں سے آنے والی فلک شگاف اور جگر خراش کراہوں سے لوگوں کے سینے چھلنی ہونے لگے۔

سورج آسمان کے بیچوں بیچ پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ مانو آگ برس رہی تھی۔ میدان کے ایک طرف سفیدے کے سائے میں کچھ کتے زبان نکالے ہانپ رہے تھے۔ دو تین چیلیں بھی شاخوں پر منقار پروں میں دبائے دبک کر بیٹھی تھیں۔ پانی کے نل پر پہرے دار مقرر تھا۔ کچھ پیاسوں نے جب پانی پینے کے لئے منتیں کیں تو انہیں ڈنڈوں سے پیٹا گیا۔ ایک لکلکاتے بزرگ نے جب ایک سپاہی سے ہاتھ جوڑ کر کہا:

''بیٹا! بوڑھے پر ترس کھاؤ........ پانی پینے دو۔ تمہارے گھر میں بھی تو کوئی بزرگ ہوگا........ تمہیں اسی کی قسم۔''

سپاہی نے یہ سن کر اپنے پتلون کی زپ نیچے اتار دی۔ یہ دیکھ کر پیاسے بزرگ نے گردن جھکائی۔ سپاہی نے اپنی بندوق کی نال کا سرا بزرگ کی ٹھوڑی میں گاڑ کے اس کا سر اوپر اٹھایا اور بولا:

''بہت پیاس لگی ہے بابا؟ پانی پیو گے؟ نکال دوں؟''

بزرگ نے اپنے داہنے ہاتھ سے بندوق کی نال پرے کر دی اور سر سے ٹوپی اتار کے منہ کا پسینہ پونچھ لیا۔

دن بھر غدر جیسی صورت رہی۔ شام سے پہلے بیس پچیس نوجوانوں کے ساتھ خواجہ احمد قدوس کو بھی فوجی اپنے ساتھ لے گئے۔ علاقے میں کہرام مچ گیا۔ ہر گلی میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ عارضی انٹروگیشن سینٹر میں زخمی ہونے والوں کو اسپتال لیا جا رہا تھا۔ جن کے لال پکڑے گئے تھے ان بیبیوں نے بال کھول کے دھاڑتے ہوئے ماتم کرنا شروع کیا۔ ہر طرف چیخ و پکار اور آہ و بکا کی دلدوز صدائیں آ رہی تھیں۔

ادھر جب زینت بیگم کو خواجہ کی حراست کی خبر ملی تو وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئیں۔ نائیلہ نے روتے روتے اپنا حال برا کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے والد پر کون سی آفت ٹوٹنے والی ہے۔ اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ اگر خواجہ کو کچھ ہو گیا تو اس کی ماں جیتے جی مر جائے گی۔

اندھیرا ہوا تو نظم سے کچھ لوگ آ گئے جنھوں نے الطاف احمد اور مقبول

خان کے بھتیجے کو کسی خفیہ جگہ پر منتقل کر دیا۔انہیں ڈر تھا کہ خواجہ کہیں ٹوٹ کر الطاف اور مقبول کے بھتیجے کی بابت کچھ افشا نہ کریں۔مقبول خان کو بھی کسی اور جگہ روانہ کیا گیا۔نورالدین شاہ پریشانی کے عالم میں متاثرین کے گھروں میں جا کر انہیں دم دلاسا دینے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔سچ تو یہ ہے کہ وہ خود بھی اندر سے ٹوٹ چکے تھے۔ان کے شانوں پر بہت بھاری بوجھ آ پڑا تھا۔وہ جانتے تھے کہ انہیں کل صبح پولیس تھانہ جا کر معصوم قیدیوں کی رہائی کے لئے تگ ودو کرنی ہے۔خواجہ کی غیر موجودگی میں وہ اپنے آپ کو تنہا اور بے بس محسوس کر رہے تھے۔

جیسے جیسے رات بیتنے لگی گہرے سناٹے میں وقفے وقفے سے جگر خراش نوحے آگ کے بھڑکتے شعلوں کی طرح فضا میں لپکنے لگے........بستی میں کتنی مائیں ایسی تھیں جو اپنے جگر پاروں کے فراق میں گھر کی دہلیز پر اوڑھنی پسارے ماتم کر رہی تھیں۔کوئی مائی چلائی:

''غلام رسول! اے غلام رسول! تمہارے سامنے میرے وحید کو اٹھا کر لے گئے اور تم ہیجڑوں کی طرح تالی بجاتے رہے۔تف ہے تم پر اب میں کیا کروں رے؟ تمہاری جان کو روؤں۔کیسے بھائی ہو تم؟''

کوئی اپنا ذہنی توازن کھو کر اپنی کم سن بیٹی کو ڈانٹ رہی تھی:

''رضیہ! ارے رضیہ! تجھے بھیجا تھا نا بھائی کو لانے؟ خود آئی اسے نہ لائی رانڈ؟''

کسی مائی کی فغاں کا عالم یہ تھا:

''سعیدہ بہن! تم تو جانتی ہو رشید میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ پانچ بہنوں کا اکیلا بھائی۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو پانچ ڈولیاں کون اٹھائے گا۔ ہائے میں تقدیر کی ماری۔ میں تو اپنے لال کو ایسے دامن میں چھپا کے رکھتی تھی جیسے کوئی عورت حرام کا حمل چھپاتی ہے۔ ان گِدھوں نے کہاں سے آ کے اس پر جھپٹا مارا؟''

ایک درد بھری آواز یہ بھی تھی:

''لوگو! ہائے میں خصم پیٹی۔ رانڈ بہن کے سر پر بھائی نے ماں باپ کی طرح ہاتھ رکھا۔ خدایا! میرے میکے کے چراغ کی حفاظت کرنا۔ میں اپنے بھائی کی بلائیں لے کر مر کیوں نہ گئی۔''

نائیلہ بڑی دیر سے اپنی بے ہوش ماں کا منہ تک رہی تھی۔ زینت بیگم کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے خواجہ کی ''پھرکی'' غم کی برسات میں مرجھا گئی...... جیسے کسی نے کنول کے ڈنٹھل کو مروڑ دیا۔ آدھی رات کو زینت بیگم نے آنکھیں کھولیں۔

''ماما''

نائیلہ نے اپنی ماں کو آہستہ سے پکارا۔ زینت نے کپکپائے ہونٹ ہلائے۔

''آ گئے تمہارے پاپا؟''

نائیلہ نے اپنا ہاتھ ماں کے ماتھے پر پیار سے رکھا:

''کل تک آ جائیں گے..... آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟ میں نے شوکت انکل سے بات کی ہے۔ وہ بارہمولہ میں ہیں سویرے آ جائیں

گے۔''

زینت نے آنکھیں موند لیں:

''تم نے کہا نہیں کیسے پولیس افسر ہو کہ۔''

ان کے لہجے میں مایوسی تھی۔

نائیلہ نے پورے اعتماد کے ساتھ ماں کو دلاسا دیا:

''ہاں ہاں ماما! میں نے سب کچھ کہہ دیا۔ وہ آئیں گے ناں کل۔''

اچانک زینت بیگم کی نظر نورا پر پڑی جو ان کے پائینتی سو رہی تھی۔ وہ جیسی چونک گئیں:

''یہ کون بی بی ہے؟''

نائیلہ نے نورا کو جھنجوڑ کر جگایا:

''یہ نورا آنٹی ہے ماما۔''

نورا نے ہاتھ اٹھا کے رب کا شکر ادا کیا۔ زینت بیگم نے سر کے اشارے سے نورا کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا:

''تم کون ہو بی بی! پہلے کبھی دیکھا نہیں تمہیں۔''

نورا نے ہاتھ جوڑ کر کہا:

''بی بی جی! خطا معاف نائن ہوں رمضان کی جورو۔ جب آپ غش کھا کے گر گئیں تھیں نا تو پتہ ہے آپ کے تو دانت جکڑ گئے تھے۔ سب بیبیاں محلّے کی روتی سینہ کوٹتی ملٹری گاڑیوں کے پیچھے دوڑیں۔ میں نے آپ کے دانت اٹھائے، اور پانی چوایا۔ کیا کرتی اور؟ نائیلہ بیٹی تو حواس کھو بیٹھی تھی

۔بیچاری پر میرے منہ میں خاک آفت آن پڑی تھی۔کیا بتاؤں آپا دھاپی کا عالم تھا۔میں اپنے مرد کے ساتھ یہیں پڑی رہی آپ کے پاؤں میں۔سوچا اکیلی عورت ذات ہے اور پھر خواجہ صاحب کے ہم پر کتنے احسان---"

زینت بیگم نے ہاتھ سے اشارہ کر کے اس کی بات کاٹی:

"بس، بس، بس بھی کرو اب کتنی باتیں کرتی ہے۔رمضان کہاں ہے اور کچھ الطاف کی خبر ہے؟"

رمضان حبیب اللہ کے ساتھ دیوان خانے کی چوکھٹ پر بیٹھا تھا۔یہ باتیں سن کر ہاتھ جوڑے اندر آیا:

"بی بی جی! سب خیریت سے ہیں۔میں خواجہ صاحب پر واری جاؤں دیکھنا ان کا بال بھی باکا نہ ہوگا۔خوش وخرم آجائیں گے۔" رمضان کا گلا رندھ گیا۔زینت بیگم کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔بولیں:

"اگر میرے سرتاج کو کچھ ہوگیا تو میں اس حویلی کو پھونک پھانک کے دریا میں کود کے جان دے دوں گی۔" یہ سن کر حبیب اللہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا:

"ہائے ربا! یہ سننے سے پہلے میں مر کیوں نہ گیا۔"

نائیلہ نے حبیب اللہ کے آنسو پونچھے:

"بس چاچا! بس بھی کرو اب۔آپ کب سے رو رہے ہیں۔کچھ کھانا بھی کھلاؤ گے ماما کو کہ نہیں؟"

زینت نے یہ سن کر منہ دوسری طرف پھیر لیا:

''مجھے رغبت نہیں۔تم سب کھاؤ۔رات بہت ہوئی ہے۔نورا جاؤ رسوئی میں سب کو کھانا کھلا کے آؤ۔''

یہ سن کر نورا کی آواز بھرائی:

''نہ بی بی نہ!میں نائن آپ کے چوکے میں کیسے جاؤں؟''

زینت بولیں:

''دیکھ نورا! مجھے اور دق نہ کر۔اور جب تک خواجہ صاحب نہیں آتے تم دونوں ہمارے ساتھ ہی رہو گے رمضان سے کہو کہ کل نرگس کو لے کر آئے۔''

رمضان کرتے کے دامن سے آنسو پونچھنے لگا۔

صمد بٹ نے جب صبح اخبار میں کریک ڈاؤن سے متعلق خبر پڑھی تو ان کے اوسان خطا ہو گئے۔اسی وقت اپنی بیگم کے ساتھ سرینگر روانہ ہوئے۔آخر سمدھیانے کا معاملہ تھا۔جی ہاں سمدھیانے کا........قصہ یوں ہوا تھا کہ جس دن صمد بٹ اور کرتار سنگھ نورالدّین شاہ کے گھر سے اندھیرے میں روانہ ہوئے تھے شاہ کی بیگم سارہ اور ان کی بیٹی شمع نے بٹ کی بیٹی خالدہ کو یہ کہہ کر روکا تھا کہ یہ وقت ایک جوان لڑکی کو ساتھ لے جانے کا نہیں۔خالدہ دو چار دن نورالدّین شاہ کے گھر کیا رہی کہ سب کا من موہ لیا۔شمع اس کی سہیلی بن گئی۔خالدہ کو بھی شاہ کی فیملی سے کافی انس ہو گیا۔

اور جب منظور احمد کو اسپتال سے چھٹی ملی تو صمد بٹ،ان کی بیگم اور بیٹی

تینوں نورالدّین کے گھر تہنیت کے لئے آئے۔ خالدہ کو دیکھ کر سارہ بیگم اور شمع کے دلوں سے جیسے فراق کی دھند چھٹ گئی۔ تیسرے پہر جب بٹ نے رخصت مانگی تو سارہ بیگم نے گھر کی دہلیز پر خالدہ کی باہ پکڑ لی اور اسے رسوئی میں بٹھایا:

''تو کہاں جائے گی؟ یہاں اتنے کام پڑے ہیں، یہ کون کرے گا؟ پھر اتنے دن کے بعد تو آئی ہے۔ اب تو گھر میں سکھ شانتی ہے۔ مہمانوں کا تانتا بندھا ہے۔ کچھ روز رہ کر جاؤ۔''

خالدہ کو لگا جیسے اس کی اپنی ماں ممتا کا حق جتا رہی ہے۔ پھر سارہ بیگم نے صمد بٹ سے ملتجانہ لہجے میں کہا:

''بھائی صاحب! اگر اعتراض نہ ہو تو خالدہ بیٹی کچھ دن رہ کر آئی گی۔'' بٹ کو لگا جیسے سارہ بیگم خالدہ کا رشتہ مانگ رہی ہیں۔ وہ ایک دم چونک گئے:

''بھابی! آپ کی مرضی۔''

جیسے انہوں نے رشتہ قبول کیا۔

اُس دن سب نے رات کا کھانا کھایا۔ چوکا برتن کرنے کے بعد شمع نے خالدہ کو چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا:

''جا اسے کاکو دے کر آ۔''

خالدہ نے حیرانی سے پوچھا:

''کاکا؟ کون کاکا؟''

شمع نے گیلے ہاتھوں کا پانی اس کے منہ پر چھڑک کر کہا:

''ارے پگھلی! منظور بھائی کو پیار سے سب کا کا کہتے ہیں۔'' یہ سن کر خالدہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ ہنسی کے ساتھ اس کے منہ سے ''کا کا۔ کا کا'' نکل رہا تھا۔ شمع نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھا:

''پاگل ہے تُو؟ اتنا زور سے ہنستے ہیں؟ ابو سنیں گے تو کیا کہیں گے؟''

خالدہ نے اپنی ہنسی پر مشکل سے قابو تو پا لیا مگر اس کے منہ کی حالت پانی کے اس نل کی سی تھی جس کے ناکارہ جوڑ کی جگہ سے پانی کی پچکاری نکلتی ہے۔ اس پر کتنا بھی کپڑا رکھو، کہیں نہ کہیں سے پانی راستہ نکال کر رستا رہتا ہے۔

اور جب اس نے چائے کی پیالی منظور کے سامنے رکھی تو پانی کے تیز بہاؤ کے آگے دھجی کی پکڑ کمزور پڑنے لگی۔ پیٹ کی تھالی تھل تھل ہچکولے کھانے لگی۔ اور اچانک پانی کا ایک فوّارہ چھوٹا: .... ''کا کا'' اور وہ اوڑھنی کا کونا منہ میں ٹھونس کر دوڑتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی۔ منظور ہکا بکا رہ گیا۔ وہ منمنایا:

''سچ کہتی ہے شمع .... باؤلی ہے یہ لڑکی۔''

عورت اپنا تن، من، دھن یہاں تک کہ اپنی آتما تک مرد پر نچھاور کرتی ہے مگر دل کی گرہ کھولتی ہے تو اپنی ہم جنس کے آگے ...... شاید اس لئے کہ دل کی گرہ کھولنے میں جو تکلیف ہوتی ہے اسے مرد محسوس نہیں کر سکتا۔ عورت کے

دل کا زخم جب شمع کی طرح پگھلنے لگتا ہے اس کی ہم جنس ہی ٹپکتے ہوئے موم کے قطروں کو پلکوں پر جگہ دیتی ہے۔ سو شمع نے بھی اپنی زنبیل خالدہ کے آگے کھول دی۔ خالدہ سوچتی تھی کہ اس زنبیل سے بھی مداری کے تھیلے کی طرح کئی مسحور کن چیزیں برآمد ہونگیں...... مگر وہاں سے ایک کھلونا نکلا...... ٹوٹا پھوٹا کھلونا۔ رات پہلے پڑاؤ پر تھی۔ شمع نے عجیب دردانگیز خاموشی کو توڑا:

''محبّت کی ہے کسی سے کبھی؟''

خالدہ چونک کر بولی:

''........اری کیا بے ہودہ سوال پوچھتی ہے؟ جہاں چار نظروں پر سینکڑوں نظریں پہرہ دیتی ہوں وہاں عشق کا بیج پھوٹنے سے پہلے ہی ناس ہو جاتا ہے۔''

پھر اس نے آنکھیں مٹکا کے، ٹہوکا دیتے ہوئے شمع کے دل کی خبر لی:

''مگر تو اپنی سنا۔ اتنی خوبصورت ہے یہ ابھرواں جسم، گوری چمڑی، انگ انگ میں جوانی کا نشہ۔ تجھے تو دیکھ کے ہی جوانوں کے دل سینوں سے اچھل کر باہر آتے ہونگے۔''

شمع کو جیسے اسی ساعت کا انتظار تھا۔ جیسے وہ چاہتی تھی کہ اس کے زخم کی شمع پگھلنے لگے اور خالدہ اپنی پلکوں پر موم کے قطروں کو سہلائے:

''چھوڑ........ ان باتوں میں کیا رکھا ہے؟''

خالدہ کو لگا جیسے شمع کے دل میں سوئے ہوئے کسی پرانے زخم سے کھرنڈ اٹھا۔ ہمت کر کے پوچھا:

''کون ہے وہ؟''

شمع نے منہ دوسری طرف پھیر لیا:

''ہے نہیں تھا۔''

''تھا مطلب؟''

خالدہ نے اس کے شانوں کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔ ادھر سسکیاں بولنے لگیں:

''چاچا (خواجہ احمد قدوس) کا چھوٹا بیٹا محمود۔ بچپن کی دل لگی جوانی میں عشق کا روپ اختیار کر گئی۔ اور عشق ہمیشہ کا روگ بن کر رہ گیا۔ جن کانوں میں بھنک پڑنی تھی، پڑ گئی اور چاچی نے بڑی چالاکی سے اس کی شادی اپنی ایک رشتہ دار لڑکی سے کر دی۔ امیر زادی ہے تو ہے، شکل صورت میں تو میرے تلوؤں کو بھی نہ پہنچے...... پھل پھول پائی۔ ایک بچہ ہوا پچھلے برس...... آیا تھا ہمارے گھر، میں نے شکل بھی نہ دیکھی نامراد کی۔ وہ تو کہو کہ بچپن کی دل لگی تھی ورنہ میں اتنی بھی کچی نہ تھی کہ ایسے بزدل پر پھسل پڑتی۔''

پھر سسکیوں میں بولنے کا یارانہ رہا۔ خالدہ سہم کر اپنے وجود میں سمٹ گئی۔ اسے لگا جیسے اس کے خواب کا چینگی پوٹا اڑنا چاہتا ہے مگر گھونسلے کے دہانے پر آ کر گرنے سے ڈرتا ہے۔ وہ اس زخم کے بارے میں سوچنے لگی جس کی سلسلاہٹ آدمی کو زندگی بھر تڑپاتی ہے...... ترساتی ہے...... کیسا ہوتا ہے وہ زخم؟

اور جب منظور کی آنکھیں خالدہ سے ملتیں تو خالدہ کو لگتا جیسے اندھیری

رات میں کسی پہاڑ کے پیچھے بجلی چمکی اور اس کی روح کی جھیل ایک لحظہ کے لئے جھلمل جھلمل ہوگئی۔ وہ دیکھتی کہ جھیل میں آسمان سے تڑخ تڑخ پانی برس رہا ہے۔ لہریں جیسے کتاں کی چادریں پھُر پھُرا رہی ہیں۔ پھر مچھلیوں کی ڈار سے اچانک ایک مچھلی لپک کر سطح پر بل کھاتی ہوئی لہرائی .... سفنوں کی چمک سے ایسا لگا جیسے اچانک چاند کے ہاتھ سے موتی کی مالا چھوٹ گئی۔ کنارے پر کونجیں، قاز، بط، مرغابیاں، سرخاب پانی میں منقاریں ڈال کر پروں کو بھگوتے، پھریریاں لیتے، پروں سے بوندیں چھٹکاتے۔ بادلے سے منڈھے ہوئے بید کے درختوں کے پتوں سے زمرد کے قطرے ڈھلک ڈھلک کے گر رہے ہیں۔ عجیب خواب سنا عالم جس میں منظر متحرک تو تھے مگر آوازیں جیسے گم ہوئیں تھیں۔ وہ اس بجلی کی کڑک، پیاسی جھیل میں گرتے ہوئے پانی کے تریڑے کا تڑاقا کتاں کی چادر کی سرسراہٹ، فراق زدہ چکوا چکوری کی درد بھری فریاد، پرندوں کے پروں کا چھرچھرانا سب کچھ اپنے کانوں سے سننا چاہتی تھی........ مگر وہاں کوئی آواز نہیں تھی، صرف ایک لمحے کی چکاچوند تھی جس میں صدیاں گزر گئیں۔

بجلی کی اس کوند سے ایک کرن شمع نے آنکھوں میں بھر لی جس سے اس نے روشنی کا ایک محل بنایا اور اس محل کے دو میناروں پر منظور اور خالدہ سفید برّاق کبوتروں کی طرح ایک دوسرے سے ملنے کے لئے پر تول رہے تھے، دونوں ڈرے ڈرے، سہمے سہمے۔ پھر دو میناروں کے بیچ وہ رات آئی جب شمع نے خالد کے دل کی فاختہ کو اپنی مٹھی میں بھر لیا۔ فاختہ کانپ رہی

تھی.......ہانپ رہی تھی۔

''میں نہیں جانتی محبت کیا بلا ہوتی ہے.....اور مجھے کسی سے محبت نہیں۔''

''کھا قسم''

''تیری قسم۔''

''نہیں....... کاکا کی قسم کھا۔''

''کیوں وہ کوئی فالتو چیز ہیں؟''

پھر شمع نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔شمع کی اس سرد مہری سے خالدہ مایوس ہوئی۔وہ چاہتی تھی کہ شمع منظور کے بارے میں ڈھیر ساری باتیں کرے اور رات ریشمی آنچل کی طرح اس کے دل کے تاروں کو چھوتی ہوئی سرکتی جائے:

''سو گئی کمینی۔''

اسے شمع پر بہت غصہ آیا۔لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ شمع خیالوں ہی خیالوں میں روشنی کے محل کو موتیوں کی مالاؤں سے سجا رہی تھی۔اپنے کبوتروں کو آبِ زلال سے نہا رہی تھی۔اس کے کبوتر پروں کو جھٹک رہے تھے۔وہ ان کے پروں اور پوٹوں کو چوم رہی تھی۔دونوں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر بادلوں میں اڑ رہی تھی۔وقت جیسے تھم گیا تھا۔کبوتروں کے پروں سے ٹپکتی ہوئی بوندیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔انہیں زمین تک پہنچنے کے لئے جیسے صدیاں گزر گئیں۔

دن ڈھلنے سے پہلے ہی خالدہ کی خواب بستی سانولانے لگی۔شام ہوتے ہوتے جب پرندے جھنڈ کے جھنڈ اپنے آشیانوں کی طرف محوِ پرواز تھے تو

اسے لگا کہ اسکے خواب کا چینگی پوٹا کب کا پھد کتے پھد کتے اڑ گیا ہے۔ اڑتے اڑتے پرندوں کی ڈار سے ملا۔ مل کے بچھڑا، اور بچھڑ کے کہیں کھو گیا۔ اس کی آنکھوں پر ملال کی دھند چھا گئی...... وہ سوچنے لگی یہ شمع کو آج کیا ہو گیا؟ کیوں یہ میرے دل کے افق پر پھیلی ہوئی مایوسی کی پر چھائیں کو نہیں دیکھتی؟ کیا میری الف لیلیٰ کے سارے دروازے بند ہو گئے؟ وہ بستر میں اپنی شہزاد کے انتظار میں تڑپتی، بلبلاتی، بے تابانہ لوٹتی رہی۔

بہت دیر کے بعد جب شمع آئی تو خالدہ نے منہ چڑا کر پوچھا:

• ''کیوں صاحب! کیا معاملہ ہے۔ اب تو آدھی رات تک غائب رہنے لگی ہے۔ سچ بتا کہاں تھی اتنی دیر؟''

شمع شوخی پر اتر آئی۔ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے کہا:

''میں........؟ میں تو قادر کانچی سے ملنے گئی تھی۔'' ''اب یہ قادر کانچی کون ہے؟'' خالدہ نے رکھائی سے پوچھا۔ ''یار ہے میرا۔''

شمع خالدہ کے پاؤں دبا کے اسے منانے لگی۔

''قادر کانچی ادھر گلی میں دکان کرتا ہے۔ دکان کیا ہے ساری دنیا کا اگڑم بگڑم جمع کیا ہے۔ بیس پچیس برس پرانا مال خریداروں کے انتظار میں سڑ رہا ہے...... دو چار مٹی کی ہانڈیاں جو ایک ہی قطار میں برسوں سے اوندھے منہ پڑی ہیں۔ زنگ کھائے ہوئے دو تین توے، پھاوڑے، بیلچے، مقراضیں، کیلیں، کلہاڑیاں، آریاں، چمٹے، لوٹے، درانتیاں، چوہے دان، آریاں، چوبی

ڈوئیاں، دوایک کانگڑیاں، حقے، چلم، نیچے، اینٹ کے بھٹے سے نکلے ہوئے کوئلے، اور نہ جانے کیا کیا خرافات۔ دن بھر چوکی پر بیٹھ کر حقہ گڑ گڑاتا رہتا ہے۔ تمباکو میں چرس ملاتا ہے۔ کبھی کبھی افیون کا نشہ بھی کرتا ہے۔ پھر پینگ میں آکر آسمان کی طرف لال لال دیدے کر کے الم غلم بکنے لگتا ہے:

''حیات مثلِ تارِ عنکبوت است وکبوت است وکبوت است۔ پنجابی ترکھان خنزیر کا پوت است و پوت است و پوت است۔ میری کانچی دانۂ شہتوت است وتوت است وتوت است۔ غلام نبی از قوم لوط است ولوت است ولوت است، قادر در منزلِ ناسوت است وسوت است وسوت است۔''

اس دوران میں اگر کوئی اسے دیکھ کر ہنسنے لگے تو اپنی دہکتی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ کے گردان میں ایک اور جملے کا اضافہ کرتا ہے:

''تیری ماں کی ....''

''بس بس بس بس........ کمینی کہیں کی۔''

خالدہ نے مسکراتے ہوئے شمع کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

''اس بیچارے کی بھی عجیب ٹریجڈی ہے۔''

شمع نے قصہ کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی یہ سبز قدم جوانی کی دہلیز پر لڑکھڑا ہی رہا تھا کہ ماں باپ اوپر تلے گزر گئے۔ باپ کوئلے کا تاجر تھا۔ کافی روپے جمع کئے تھے مگر ناگ کی طرح پونجی پر پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ بیٹا چونی مانگتا تو پھنکارنے لگتا۔ بچپن میں قادر

کے سر میں پھوڑے نکلے۔ پھوڑوں میں پیپ پڑ گیا جو منہ پر رسنے لگا۔ اکلوتی اولاد کی اس دردناک حالت پر بھی قارون باپ کو رحم نہ آیا۔ دوا نے خرچ نہ کئے۔ ماں بیچاری روتی بلکتی رہی۔ آخرِ کار ایک نیم حکیم کے پاس لے گئی۔ اس دوزخی نے پتہ نہیں کیسا مرہم لگایا کہ پھوڑے تو ٹھیک ہو گئے مگر سر ہمیشہ لے لئے صفا چٹ........ مٹّی کی ہانڈی کے پیندے کی طرح۔ ماں نے ٹکلے بیٹے کو کالے رنگ کی قرہ قلی پہنائی۔ کہتے ہیں اپنا شال بیچ کے یہ ٹوپی خریدی تھی اسی لئے ماں کی نشانی کو سر سے جدا نہیں کرتا۔ سنا ہے سوتے میں بھی اسے سر پر رکھتا ہے کہ کہیں چوہا کتر نہ لے۔ کثرتِ استعمال سے ٹوپی کا استر ادھڑ کے جگہ جگہ سے جھانکتا ہے۔ بوسیدہ ہوتے ہوتے کانوں پر آ گئی ہے جس سے دونوں کان مڑ گئے ہیں۔ بالکل چھچھوندر لگتا ہے......... ماں باپ کے گزرنے کے بعد گھر بار بسانے کے چکر میں ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے۔ میانجیوں (بچولیوں) نے جب دیکھا کہ مشٹنڈا مستی میں بھرا ہے، دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ میانجی بھی بیچارے کیا کرتے جس لڑکی کو اس کی فوٹو دکھاتے وہ خودکشی کرنے کی دھمکی دیتی........ کون اس ہیچ پوچ سے شادی کر کے جیتے جی دوزخ جھیلتی۔ میانجیوں سے مایوس ہو کر عورتوں کے ایک اسمگلر سے گٹھ جوڑ کیا۔ اس نے موٹی رقم لے کر نیپال سے ایک نازنیں لا کر دی........ اس نازک اندام کو دیکھتے ہی دیدہ ور سمجھ گئے کہ قادر نے اپنی کشتی میں اپنے ہی ہاتھوں سے برما گھما کر چھید کر دیا۔

نازو انداز کا عجیب عالم تھا۔ ہاتھوں میں پور پور چھلے، گوری گدرائی

باہوں میں چھنکتی چوڑیاں، کانوں کے جھمکے جھوم کر جھونکے لیتے، نیم وا آنکھوں میں کاجل کی کٹاری، سرخ گالوں پر سنہری زلفوں کے ناگ، چپٹی ناک میں چاندی کی نتھ کا ماہِ کامل۔ سینہ ابھرا ابھرا۔ گریبان اتنا کھلا کہ چھاتی کچھ کچھ نظر آئے۔ پیڑو تھلتھلاتا........ گچیں نمایاں۔ کچھ روز ٹھمک ٹھمک کے، لچک لچک کے، لہک لہک کے قادر کو ''کانچا کانچا'' کہہ کے رجھاتی رہی۔ قادر کے تو پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹکتے تھے:

''کانچی ایسی ہے۔ کانچی ویسی ہے........ کانچی نے یہ کیا۔ کانچی نے وہ کیا........ کانچی نے ایسا کہا۔ کانچی نے ویسا کہا۔''

غرض سننے والوں کے کان پک گئے۔

ادھر ہمسایہ کے گھر میں ایک پنجابی ترکھان کام کر رہا تھا۔ اس خبیث کے بچّے کا دل کانچی پر آ گیا۔ اس بدراہ نے بھی اپنی طرف سے کمک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی........ نتیجہ یہ کہ ایک دن کانچی قادر کی ماں کے سارے زیورات اڑا کے پنجابی ترکھان کے ساتھ پھُر ہوگئی۔ بس تو پھر کیا تھا۔ قیامت ٹوٹ پڑی قادر پر۔ باؤلا ہوگیا۔ پولیس تھانے کے چکّر لگاتے لگاتے تلوے گھسائے........ مگر کانچی نہیں ملنی تھی، نہ ملی۔ کانچی کے فراق میں رات رات بھر پچھاڑیں کھا کھا کے روتا اور جس کے گھر میں پنجابی ترکھان کام کرتا تھا اس کو گالیاں دیتا:

''غلام نبی! تیری ماں کی، بہن کی.... حرامی سالے! ترکھان تیری تین بہنوں میں سے کسی ایک کو بھگا کر کیوں نہ لے گیا۔ کنجر تو نے پرانی عداوت

نکالی........ ترکھان کا حوصلہ بڑھایا۔ دیکھنا کتے کی موت مرے گا۔ سالے! تیری بہنیں رانڈ ہو جائیں گی........ پھر میں تینوں کو اپنے آسن تلے رکھوں گا۔''

غلام نبی کے گھر میں سناٹا پسرتا۔ گھر کے سب لوگ کونوں میں دبک کر بیٹھ جاتے۔

اب بھی محلّے کے شریر لڑکے قادر کو چڑانے کے لئے نکڑ پر آواز لگاتے ہیں: ''کانچی'' .... تو قادر اچھل اچھل کر ان کو یہ موٹی موٹی گالیاں دیتا ہے۔ سارے محلّے میں سراسیمگی پھیل جاتی ہے۔ محلّہ والوں سے کئی بار کہا کہ اپنے لونڈوں کو سمجھاؤ ورنہ کسی روز مجھ سے قتل ہو جائے گا۔ پھر مجھ پر الزام نہ دھرنا۔ ایک دفعہ جمعہ کے خطیب سے شکایت کی کہ محلّے کے لڑکے بالے ''کانچی'' کہہ کے مجھے چڑاتے ہیں آپ ذرا اپنے خطاب میں ان کی سرزنش کیجئے۔ خطیب صاحب کچّے تھے دورانِ خطبہ تذکرہ چھیڑا کہ ''محلّہ کے ایک بزرگ شخص قادر صاحب کی شکایت ہے کہ کچھ لڑکے انہیں ''کانچی کانچی'' کہہ کے چڑاتے ہیں۔ میں ان کے والدین سے مؤدبانہ گزارش کرتا ہوں کہ وہ اپنے صاحب زادوں کو سمجھائیں کہ وہ آئندہ قادر صاحب کو ''کانچی کانچی'' نہ کہیں۔ ایک بزرگ انسان کو ''کانچی کانچی'' کہہ کے چڑانا اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔ مجھے امید ہے کہ والدین اپنے صاحبزادوں کو ضرور سمجھائیں گے کہ وہ قادر صاحب کو ''کانچی کانچی'' کہہ کر نہیں چڑائیں گے''۔

خطیب صاحب نے ''کانچی'' لفظ کی اتنی تکرار کی کہ کچھ بدمعاش لڑکے

موقعہ پر ہی اپنی ٹوپیاں منہ میں ٹھونسے، ہنسی دبائے مسجد سے نکل گئے۔ قادر یہ سب دیکھ رہا تھا۔ جل بل کر اٹھا اور خطیب سے مخاطب ہوا: ''ابے او کٹھ ملا! یہ کیسی جھک مار رہا ہے؟ تو ان ابلیسوں کو سمجھانے کی آڑ میں مجھے چڑا رہا ہے؟ یہ والدین اور یہ صاحب زادے تیرے سگے ہیں کیا؟ اور یہ بزرگ کس کو کہتا ہے؟ بزرگ ہوگا تیرا باپ ..... مزاجِ شریف کچھ ٹھنڈا ہوا کہ دکان پر تربوزے کی پھانک کھلاؤں...... نمک چھڑک کے؟'' یہ کہہ کر دامن جھاڑا اور مسجد سے نکلا۔ تب سے مسجد کا رخ نہیں کیا۔ اذان کے وقت لیٹ کر چادر تان لیتا ہے۔ خطیب بے چارے کی تو آبرو برباد ہوگئی، وہ بھی یک مشت ...... پھر نظر نہ آیا۔''

قادر کا کابک نما گھر پرانے زمانے کی اینٹوں سے بنا ہے۔ اوپر والی منزل کو ایک چرخ چوں سیڑھی جاتی ہے جو اس قدر ڈولتی ہے کہ چڑھنے والا کلیجہ پکڑ کے کہتا ہے اب گری کہ اب گری۔ پتہ نہیں کہ کس بھونچال میں مکان کا اوپر والا حصہ ہمسایہ کے مکان کی دیوار پر جھک پڑا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے پرانے گھر کو گرا کر نیا بنانا چاہتے ہیں۔ تس پر یہ دھمکی دیتا ہے کہ اگر میرے مکان کی ایک اینٹ بھی اکھڑ گئی تو سب کچھ ملیا میٹ کر دوں گا۔

''مگر تو اس وقت اس پاگل سے ملنے کیوں گئی تھی؟''

خالدہ کو سچ مچ میں تشویش ہوگئی۔

''ڈرمت میں اس وقت کانجی کی بغل میں سونے کے لئے نہیں گئی تھی تیرے رشتے کی بات کرنے گئی تھی'' Qadir Weds Khalida کیسا لگے گا''

''دُت تیرے منہ میں انگارے۔''

خالدہ نے ناک بھوں ایسے چڑھائے جیسے کمرے میں سڑے ہوئے چوہے کی سرانڈ پھیلی ہو۔

''میں تو اپنی جوتی بھی نہ چھونے دوں مردود کو۔ مگر تیرا تو یار ہے۔ خصم کیوں نہیں بناتی۔ چھڑے چھٹانگ تو ہے۔ نہ ساس کا جھنجٹ نہ سسر کی کھٹ پٹ۔ اس پر لطف یہ کہ ایک پاؤں میکے میں دوسرا سسرال میں۔ بیچ میں۔''

شمع نے اس کے گال کھینچ کے اس کی بات کاٹی اور جملہ پورا کیا:

''بیچ میں محلّے کے لونڈے عیش کریں گے........ یہی کہنا چاہتی ہے ناں بدمعاش........ ویسے گاؤں کی لڑکیاں اتنی بدمعاش ہوتی ہیں، معلوم نہ تھا۔''

خالدہ شانے اچکاتے ہوئے بولی:

''کیوں بدمعاش ہونے کا ٹھیکہ صرف شہر کی چھوکریوں نے ہی لیا ہے؟''

''چل چھوڑ یہ مذاق اب۔''

شمع نے اپنا گلا کھنکار کے کہا:

''ویسے میں تیرے رشتے کی بات امّی سے کر کے آئی۔ Manzoor Shah Weds Khalida کیسا لگے گا؟''

یہ سن کر خالدہ بھونچکی رہ گئی:

''کیا بکتی ہے؟ تیرے ابّو سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ یہی ناں کہ دو دن گھر میں کیا رکھا کہ بڑے بیٹے کو پریم جال میں پھنسایا...... کیسی رنڈی ہے؟''

''وہ تو ٹو ہے ہی۔'' شمع نے پرے ہٹ کر کہا۔

یہ سن کر خالدہ اس پر سوار ہو گئی اور اس کے بال کھسوٹنے لگی:

''کیا بولی حرام زا.........''

اسے خیال ہی نہ رہا کہ کھیل ہی کھیل میں اس کے منہ سے کیا نکلنے والا تھا۔ اتنی بھی بے تکلفی نہ تھی کہ وہ..... ایک لمحے کے لئے جیسے اس کے بدن میں بجلی دوڑ گئی۔ اس کی شریانوں میں بہتا ہوا لہو خشک ہو گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک سُن ہو گئی۔ اس کی پکڑ ڈھیلی پڑ گئی۔ شمع کو جیسے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ اس نے ایک ہی جست میں خالدہ کو بستر پر پٹک دیا اور اس کی رانوں کو آسن تلے دبا کر اسے گدگدانے لگی:

''کیا بولی؟ کیا بولی؟ بول کیا بولی؟''

خالدہ کے منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکل رہی تھیں: ''خ خ۔ خو خو۔ خا خا۔ خت خت.........'' ادھر شمع پوچھے جا رہی تھی:

''کیا بولی؟ بول......... بول۔''

خالدہ نے مشکل سے کہا:

''تُو گدگدانا بند کر......... قسم سے میں بولوں گی۔''

شمع نے ہاتھ اس کے پہلو سے ہٹائے:

''بول اب۔''

''بولوں؟''

''ہاں ہاں بول۔''

''بولوں؟''

''بولتی ہے یا''

''حرامزادی!'' خالدہ پھسپھسائی

شمع نے اسے پیار سے گلے لگایا.... اپنے پہلو میں لٹایا پھر وہ اس کے چہرے کو بے تحاشا چومنے لگی:

''میری اچھی بھابی۔''

خالدہ کا چہرہ دانۂ انار ہوگیا........ آنکھوں میں لال لال ڈورے دمک اٹھے.... اس نے اپنا چہرہ شمع کے سینے میں چھپایا۔

حالات کی نزاکت کے پیش نظر نکاح کی رسم نہایت سادگی سے انجام دی گئی۔ آدھی رات کو دلہن کا جوڑا پہنا کے خالدہ کو دیوان خانے میں لایا گیا۔ ادھر اسی وقت شمع نے اپنے بھائی کا ماتھا چوم کے اس کی چھنگلیا میں مہندی لگائی۔ دونوں گھروں میں اگرچہ کچھ دیر کے لئے ''ون وُن'' گایا گیا مگر اس بات کا خیال رکھا گیا کہ ''ون ون'' کے سر کسی غم زدہ مائی کے بین سے اونچے نہ ہوں۔ صرف قریب کے رشتہ داروں کو خبر کی گئی۔ صمد بٹ کے گھر میں مہمانوں کی تواضع کا انتظام کرتار سنگھ، ہرپریت کور اور ان کی بڑی بہو کے ذمہ رکھا گیا تھا۔ دونوں گھروں میں کیمرہ کی آنکھ یادگار منظروں کو قید کر رہی تھی۔

دو دن کے بعد البم تیار ہو کر آئے جو کچھ دنوں کے بعد ادل بدل ہوئے۔ کئی دنوں تک سمدھیانے کے قریبی رشتہ داروں کی پہچان ہوتی رہی۔ پھر وہ دن بھی آیا جب منظور اپنے بستر میں لیٹے لیٹے اپنی دلہن کی تصویر

ہرزاوئے سے دیکھ کر بے تابی میں لوٹتا رہا اور خالدہ اپنے دلہے کے چہرے کو چوم چوم کر سینے سے لگائے سونے کی کوشش کرتی رہی۔

''خالدہ!''

جیسے سنکتی ہوئی ہوا سرگوشی کرتی اور وہ چونک کر بڑبڑاتی:

''جی!''

جدائی کی آگ اس کے مساموں تک کو پگھلا رہی تھی۔

پھر وہ دن بھی آیا جب شمع نے دونوں کو کچھ لمحات کے لئے ہی سہی ملانے کی سوچی۔ اس کے من میں آیا کہ اکیلے میں دو دو باتیں کریں گے، ایک دوسرے کے مزاج کو ذرا سمجھیں گے۔ خالدہ کو خبر ہوئی تو ٹالا بالا بتا کر گھر سے نکلی۔ سیدھے سادھے صمد بٹ سمجھ نہ سکے مگر حفیظہ بیگم جہاں دیدہ تھیں دیکھ رہی تھیں کہ نکاح کے بعد سے بیٹی کے طور بے ڈھنگ ہیں۔ پاؤں کہیں ڈالتی ہے، پڑتا کہیں ہے۔ آنکھیں چکر مکر چلتی ہیں جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔ اس لئے جانے کی جازت تو دی مگر سمجھایا کہ حالات ٹھیک نہیں، اپنا خیال رکھنا اور تیسرے پہر تک گھر لوٹنا۔

منظور شمع کو لے کر ٹیکسی میں پہلے سے ہی بس اسٹینڈ پہنچ گیا تھا۔ جگہ جگہ پوچھ تاچھ، جامہ تلاشی اور پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ ایسے حالات میں انتظار کے کچھ لمحات اس پر بے حد گراں گزرے۔ آخر بس آئی تو اس کی جان میں جان آ گئی۔ خالدہ نے ہلکے بینگنی رنگ کا سوٹ پہنا تھا۔ وہ گھبراتے ہوئے سیدھے آ کر ٹیکسی میں شمع کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ منظور نے ٹیکسی اسٹاٹ کر کے راحت کا

سانس لیا۔بٹہ مالو سے نہرو پارک تک نجی گاڑیاں کم ہی چلتی تھیں۔زیادہ تر ملٹری گاڑیوں کی آمدورفت تھی۔منظور نے نہرو پارک کے قریب ٹیکسی کھڑی کردی۔اس نے دیکھا کہ جھیلِ ڈل پر عجیب مایوسی چھائی ہوئی ہے۔جیسے یہ جھیل کسی منحوس سائے کے کفن میں لپٹی اپنا جنازہ اٹھنے کا انتظار کر رہی ہے۔کنارے کی سیڑھیوں پر کئی شکارے والے حقہ پی رہے تھے۔ان کی آنکھوں سے نا امیدی ٹپک رہی تھی۔وہ جس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے اس کے بارے میں انہیں صرف اتنا معلوم تھا کہ بی۔بی۔سی اور وائس آف امریکہ (وہ بی بی سنگھ اور بھائی صاحب امریکہ کہتے تھے، جو ان کے اچھا لگتا تھا۔) کی خبروں کے ذریعہ سے پوری دنیا کشمیری مسلمانوں کے قتلِ عام پر سیخ پا ہو رہی ہے۔انہوں نے اچنبھے سے تین مقامی سیاحوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ان کی خالی خالی آنکھوں سے لگ رہا تھا جیسے وہ منظور سے کہہ رہے ہوں:

''بابو!اس جھیل کے سب پرندے گولیوں کی گھن گرج سے گھبرا کر بھاگ گئے ہیں تم اس قبرستان میں مستورات کو لے کر کیا اٹکھیلیاں کرنے آئے ہو۔''منظور جیسے ان کی آنکھیں پڑھ رہا تھا۔جھینپتے ہوئے پوچھا:

''سنو بھائی کوئی آرہا ہے۔''

ایک شکارے والے نے حقہ اپنے ساتھی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''ہاں ہاں جی!میں آرہا ہوں۔''

اس نے شکارے کو سیڑھی کے قریب لایا۔تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ

کر شکارے میں سوار ہوئے۔شکارے نے ذرا سا کیا ہچکولا کھایا کہ خالدہ کے منہ سے ''اوئی ماں'' نکلا۔اس پر منظور اور شمع دونوں ہنس پڑے۔خالدہ کھسیانی ہوگئی۔منظور ایک طرف اور خالدہ اور شمع صوفے کے دوسری طرف بیٹھ گئے۔ہر طرف مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔صرف چپو چلتے وقت چھپ چھپ کی آواز آرہی تھی۔منظور نے شکارہ والے سے کہا:

''بھائی! چار چناری کی طرف لینا۔''

یہ سن کر خالدہ خوش ہوئی۔اسے چار چناری دیکھنے کا بہت شوق تھا۔

''حضرت میری مانیں تو اس طرف نہ جائیں۔''

شکارہ والے نے بلند آواز میں کہا۔

خالدہ کا دل ٹوٹ گیا:

''کیوں؟۔''

'منظور نے پوچھا۔شکارہ والے نے اسی لہجے میں جواب دیا:

''بھائی! وہاں ملٹری نے چوکی پہرہ بٹھایا ہے۔مستورات ساتھ ہیں اس لئے منع کر رہا ہوں۔آگے آپ کی مرضی۔''

یہ سن کر منظور نے کہا:

''ٹھیک ہے پھر ایک چکر کاٹ کے حضرت بل (درگاہ شریف) لے چلو۔''

شکارہ والے نے ہلکا سا موڑ کاٹا۔اتنے میں منظور کو شرارت سوجھی۔اس نے یکایک پانی کا چھپکا شمع کے منہ پر مارا۔اس کا چہرہ اور دوپٹہ بھیگ گیا:

''منظور بھائی! یہ کیسی شرارت ہے؟ پلیز ایسا مت کیجئے۔''

خالدہ کو اس کی یہ شرارت بھلی لگی وہ سنگھاڑے کی بیل انگلیوں سے لپٹائے مسکرا رہی تھی۔ ابھی شمع اپنے دوپٹے کے کونے سے منہ پونچھ ہی رہی تھی کہ منظور نے پھر پانی میں ہاتھ ڈالا۔ اس سے پہلے کہ چھپکا اچھلتا شمع نے خالدہ کے دوپٹے کی اوٹ لی۔ ایک لمحے کے لئے خالدہ کے سر اور سینے پر سے دوپٹہ اٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی باہوں سے سینہ ڈھک لیتی، منظور کی نگاہیں آر پار ہوگئیں تھیں۔ سنسنی سے خالدہ کی گچیں سخت ہو کر ابھر آئیں۔ اس نے فوراً شمع کے ہاتھوں سے دوپٹہ چھین کر پردہ کیا:

''ہائے اللہ! میں مر گئی، منظور کی میری محرم پر آنکھ پڑ گئی۔''

اس نے شرما کے کن انکھیوں سے منظور کی طرف دیکھا۔ منظور کو لگا جیسے خالدہ اپنے ہاتھ سینے سے لپٹا کر اشارہ کرتی ہو کہ یوں گلے سے لگاؤں گی۔ وہ اگرچہ کوہِ زبرون کی طرف دیکھ رہا تھا مگر اس کے گالوں کو خالدہ کی جوان پھبن نے گلال کر دیا تھا۔

درگاہِ حضرت بل میں نماز اور دعا کے بعد تینوں اسی شکارے میں سوار ہوئے۔ سورج آسمان پر آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکا تھا۔ شکارے کے ہلکے ہلکے ہچکولوں سے ننھی ننھی سیمابی لہریں کچھ دیر کے لئے اپنی چھب دکھا کر ختم ہو جاتی تھیں۔ ٹیکسی جب بس اسٹینڈ میں رک گئی تو شمع نے خالدہ اور منظور کو اکیلا چھوڑا میوہ خریدنے جانا تو ایک بہانہ تھا ورنہ وہ حضرت بل سے خالدہ کے لئے پکوڑوں، حلوے اور پراٹھوں کا تبرک تو لائی تھی۔ کچھ دیر کے لئے دونوں

کے بیچ گہری خاموشی کی دیوار حائل رہی۔مگر منظور کو کسی بھی صورت میں یہ دیوار گرانی تھی چاہے کتنا بھی بڑا دھما کا ہوتا۔وہ بولا:

"ایک بات کہنی تھی۔"

خالدہ نے مدھم لہجے میں پوچھا:

"کیا؟"

منظور ذرا سا ہڑ بڑایا مگر سنبھل کر کہا:

"اگر میں مجاہد بن جاؤں؟"

خالدہ جیسے بڑبڑائی:

"مرضی آپ کی۔"

خالدہ کی ان نپی تلی باتوں سے منظور کچھ لمحوں کے لئے آزردہ ہوا۔پھر بولا:

"آپ سے ایک وعدہ لینا تھا۔"

"کیسا وعدہ؟"

خالدہ نے اس کی نظروں سے نظریں ملا کر پوچھا۔

منظور نے پتلون کی جیب سے رومال نکالا اور ہاتھوں کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا:

"یہ وعدہ کہ اگر میں شہید ہو جاؤں تو آپ کسی اور سے شادی کریں گی۔" خالدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"یہی بتانے کے لئے بلایا تھا؟"

یہ کہہ کر وہ دوڑ کے بس میں سوار ہوئی۔شمع واپس آئی تو خالدہ کو نہ

پاکر پریشانی کے عالم میں بھائی سے پوچھا: ''کہاں گئی وہ؟''

منظور نے بس کی طرف اشارہ کیا۔شمع نے بس کی کھڑکی سے دیکھا کہ خالدہ سبکیاں لے رہی تھی۔اس کے دھانی رنگ کے رومال پر کاجل کے کالے بادل چھا گئے تھے۔شمع نے کھڑکی سے ہی تھیلا اس کی طرف بڑھایا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔وہ جانتی تھی کہ منظور نے کوئی ایسی بات کہی ہے جس سے بے چاری کا نازک دل ٹوٹ گیا۔شمع کے گیروا رنگ کے رومال پر بھی کالے بادل چھانے لگے۔ٹیکسی نے گلی میں آخری موڑ کاٹا۔آگے ان کا گھر تھا اس نے رومال مٹھی میں چھپایا۔کاش وہ اپنی آنکھوں پر بھی کوئی غلاف چڑھا سکتی۔

○○○○

باب ہشتم

شہید ہو گیا

''زینت!''

رات کے گہرے سناٹے میں خواجہ کی پکار سن کر زینت بیگم چونک کر بستر سے اٹھیں۔ گھبرا کر خواجہ سے پوچھا:

''کیا بات ہے...... آپ سوئے نہیں ابھی تک؟''

خواجہ بھی پلنگ پر سرہانے کے سہارے بیٹھ گئے:

''خدا کے لئے روشنی گل کر دو زینت! میری آنکھوں میں جیسے کوئی دہکتی سلائیاں پھیر رہا ہے۔''

زینت بیگم بوکھلا گئیں:

''کون سی روشنی گُل کر دوں؟ کمرے میں تو اندھیرا ہے۔ دیکھئے ایسی باتیں مت کیجئے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

خواجہ نے زینت کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا۔ ان کا دل دھم دھم کر رہا تھا۔

''پتہ ہے زینت! ابھی ابھی میں نے ایک خواب دیکھا۔''

وہ خاموش ہو گئے۔ زینت بیگم ان کے دل کی بے ہنگم دھڑکنیں سن سکتی

تھیں:

''کیسا خواب؟''

خواجہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر منت کی:

''پہلے کمرے کی لائٹ آف کردو، پھر بتادوں گا۔''

زینت نے خواجہ کا سر اپنی گود میں لیا:

''دیکھیے اگر آپ ایسی بہکی بہکی باتیں کریں گے تو میں کھڑکی سے کود کر اپنی جان دے دوں گی۔''

خواجہ نے زینت کا ہاتھ زور سے پکڑا:

''میں نے دیکھا کہ میں اور بڑے خواجہ صاحب سمندری جہاز میں حج پر جارہے ہیں۔ اچانک چاندنی رات میں جب ہمارا جہاز بیچ سمندر میں تھا، قیامت کا طوفان آیا۔ ایسی زوردار لہریں ٹکرائیں کہ جہاز کے پرزے پرزے ہوگئے۔ میں بڑے خواجہ کے ساتھ ایک پرزے پر سوار ہوا۔ پرزہ جانے کس سمت میں تیرنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم ایک پرزے میں کیسے سما گئے۔ یا تو پرزہ اس قدر بڑا ہوا ہوگا، یا پھر ہم چھوٹے ہوئے ہونگے۔''

خواجہ پھر خاموش ہوگئے۔

''پھر؟'' زینت بیگم نے پوچھا۔

خواجہ نے آہ بھرلی:

''پھر؟ زینت! پھر کیا ہوا؟ پھر کچھ ہوا تھا۔ ضرور کچھ ہوا تھا۔ مگر افسوس مجھے یاد نہیں۔ اب تو روشنی گل کردو۔ لگتا ہے جیسے جنموں سے سویا نہیں

ہوں۔ یہ روشنی میری نیند کو ڈرا کر بھگا رہی ہے۔''

زینت نے اپنا ہاتھ خواجہ کی آنکھوں پر رکھا:

''لیجئے میں اپنے ہاتھ سے آپ کی آنکھوں کو ڈھانپ لیتی ہوں۔''

تبھی خواجہ نے ایک دم سے زینت کا ہاتھ جھٹک دیا:

''زینت!...... تمہارے ہاتھ میں کئی سورج چمک رہے ہیں۔ اپنی ہتھیلی جھٹک دو۔ گرا دو ان سارے سورجوں کو۔''

اب زینت خواجہ کے ہذیان سے گھبرا گئیں:

''میں محمود کو بلاؤں؟''

خواجہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

''نہیں نہیں .... ہرگز نہیں۔ تمہیں میری قسم اسے مت جگانا۔ وہ کئی راتوں کا جاگا ہے۔ میرا پھول جیسا بچہ۔ ابھی کل کی بات ہے روٹی کو لوٹی کہتا تھا۔ اس کے منہ پر تھپڑ مارنے سے پہلے اس بدبخت افسر نے میرے سینے میں گولی کیوں نہ اتار دی...... ہائے زینت جس کو ہم نے کبھی پھول کی چھڑی نہیں لگائی اسی کا گال اس بدمعاش کے تھپڑ سے لال ہوا۔ زینت!...... تم نے دیکھا نہیں اسپتال میں کیسے دیدے پھاڑ پھاڑ کے مجھے دیکھ رہا تھا؟ کتنا خاموش ہوا ہے میرا چلبلا بچہ۔ اس کی مسکراہٹوں کو جیسے اچانک کوئی نوچ کر لے گیا ہے۔ نائیلہ سو گئی کیا؟ زینت! مجھے معاف کرنا۔ تمہاری بیٹی کو انہوں نے نام لے لے کر گالیاں دیں۔ ایک سوّر بولا: ''حرام کے جنے! سچ سچ بتا ورنہ تیری نائیلہ کو تیرے سامنے ننگا کر کے ان بھیڑیوں کے حوالے کر دوں

گا۔''

پھر خواجہ میں کچھ بھی بولنے کا سہارا نہ رہا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کے رونے لگے:

''زینت! مت رو...... یہ روشنی گُل کر دو۔''

خواجہ کے اٹھائے جانے کے چار دن بعد ان کا چھوٹا بیٹا خواجہ محمود کاروبار کی ساری ذمہ داریاں اپنے بڑے بھائی خواجہ مقصود کے حوالے کر کے اپنی فیملی کے ساتھ گھر آیا۔ جب تک خواجہ چھوٹ کر نہ آئے، کیا دن کیا رات ایک لمحہ اس کو چین نہ آیا۔ وہ خواجہ کے جگری دوست پولیس آفیسر شوکت احمد کے ساتھ جہاں تہاں بھٹکتا رہا۔ جو کل تک خواجہ کی کوٹھی پر حاضری دینے کو اپنے لئے سعادت سمجھتے تھے، ان میں سے اکثر آج طوطے ایسی نگاہ پھیرنے لگے۔ محمود سے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔ کسی نے کہا:

''خواجہ تو جہاں دیدہ ہیں، یقین نہیں آتا کہ وہ خود کو اس دلدّر میں پھنسائیں گے۔'' کوئی اور بولا:

''شریفوں کو اپنی حد میں رہنا چاہیئے۔ غیر تمندوں کی دستار اترتی ہے تو اسی سے لٹک کے پھانسی دیتے ہیں۔''

حتّٰی کہ ایک نمک حرام نے یہ تک کہا:

''دیکھو بھائی! خواجہ میرے دوست ہیں، میں ان کی قدر کرتا ہوں...... مگر اس طرح کے پھٹے میں ٹانگ ڈالنے کو ان کو کس نے کہا

تھا؟ میں سرکاری نوکر ہوں کل کلاں کو میرے بارے میں پوچھ تاچھ ہوئی تو صاحب! میں تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ کس کو معلوم تھا کہ خواجہ کے پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں سے روابط ہونگے۔ کون جانتا تھا کہ وہ کوئی نظم بھی چلاتے ہیں۔ خواجہ کو اتنا تو خیال رکھنا چاہئے تھا کہ اگر وہ پکڑے جائیں گے تو ساتھ میں ہم بھی کھنچے کھنچے پھریں گے۔''

یہ سن کر محمود آپے سے باہر ہو گیا۔ غصے میں اس کے منہ سے نکل گیا:

''ابے دو ٹکے کے بے ایمان، بدعنوان، چور اچکے تُو وہی ہے نا جسے رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ تُو وہی نے نا جس نے پاپا کے پاؤں پر ناک رگڑ رگڑ کر سفارش کرنے کی بھیک مانگی تھی؟ تیرے نااہل بیٹے کو میڈیکل سیٹ دلانے کے لئے پاپا کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے وہ بھول گیا؟ نمک حرام! اب پاپا پر آفت آن پڑی ہے تو آنکھوں پر اندھیری ڈال دی۔ پتہ نہیں یہ ملیٹنٹ کن پر گولیاں چلاتے ہیں۔ ان کی نظر تجھ جیسے حرام خوروں پر کیوں نہیں پڑتی۔''

مشکل سے شوکت احمد نے محمود کو گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر نکالا ورنہ عین ممکن تھا کہ طیش میں اس کا ہاتھ اٹھ جاتا۔

مگر خواجہ کے کچھ مخلص دوستوں نے اپنا سارا اثر ورسوخ استعمال کر کے ہر طرف سے دباؤ ڈالا۔ اور جب دباؤ بڑھ گیا تو خواجہ کے چھوٹنے کی ایک شرط یہ مقرر ہو گئی کہ ان کا بیٹا پولیس تھانے میں اس بات کی تحریری طور پر تصدیق کرے کہ اس نے اپنے والد کو صحیح وسالم جسمانی حالت میں وصول کیا۔ شرط

منظور ہوگئی اور خواجہ چھوٹ گئے۔ انہیں پولیس تھانے سے سیدھے اسپتال پہنچایا گیا۔ اگرچہ ان کے جسم پر جگہ جگہ پر زخم اور نیل تھے اور ان کی ڈاڑھی اور موئے زہار کی نوچا نوچی سے چمڑی ادھڑ چکی تھی مگر ڈاکٹروں کی پریشانی یہ تھی کہ خواجہ ذہنی اور نفسیاتی خلفشار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ سات دن تک اسپتال میں رہے۔ محمود اور محمد رمضان حجام نے لگ کے ان کی خدمت کی۔

ادھر نورالدّین شاہ روز سویرے پولیس تھانہ جا کر کریک ڈاؤن میں اٹھائے گئے نوجوانوں کی رہائی کا مطالبہ کرتے رہے۔ کئی دن تک ان کے ساتھ محلّہ والے وفد کی صورت میں آتے رہے پھر جب کچھ نوجوان چھوٹ کر آئے تو ان کے متعلقین نے آنا چھوڑ دیا کہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جنہیں اسپتال پہنچایا گیا۔ پھر وہ دن بھی آیا جب نورلدّین کے ساتھ وہی لوگ آنے لگے جن کے عزیز ابھی چھوٹے نہیں تھے۔ دن بھر تھانہ کے احاطہ میں ایسے لوگ پڑاؤ ڈالے رہتے۔ ایک دن بڑی مشکل سے نورالدّین نے تھانیدار کو پکڑا۔ تھانیدار نے چھوٹتے ہی کہا:

''شاہ صاحب! دس بارہ لڑکوں کو تو چھڑا کے لایا ہوں، آپ اطمینان رکھئے اللہ نے چاہا تو سب چھوٹ جائیں گے۔''

شاہ مطمین نہ ہوئے۔ بولے:

''تھانیدار صاحب! جن کو کریک ڈاؤن میں اٹھایا گیا ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ اٹھانے والے کون تھے؟ کہاں اٹھا کے لے

گئے؟ سنا ہے کہ انہیں بڑی تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں۔آپ ایسے والدین کو کیسے سمجھائیں گے جن کے لختِ جگر تڑپ رہے ہیں؟ آپ بھی آل اولا والے ہیں۔اور پھر سرکار نے آپ کو ہمارے جان و مال اور عزت و آبرو کی محافظت پر مقرر کیا ہے۔''

تھانیدار یہ سن کر ایک دم بلبلا اٹھا۔بولا:

''کیا کہا آپ نے؟ کیسی سرکار؟ کس کی جان؟ کون سا مال؟ اور کیا عزت و آبرو؟ صاحب ہم تو دونوں طرف سے لاتیں کھانے پر مامور ہیں، وہ بھی چوتڑوں پر۔اُن سالوں کو دس بار سلوٹ مارو، اپنے لڑکوں کو ماں بہن کی گالیاں دو، تب جا کے کوئی چھوٹ کے آتا ہے۔ہماری مثال تو وہی ہو گئی ہے کہ کیا کہتے ہیں منشی جی! ہاں نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم، نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔شاہ صاحب! بس یوں سمجھئے کہ چھاتی پر گھمر گھمر چکّی چل رہی ہے۔تھانہ کی حالت دیکھ رہے ہیں آپ؟ کیسی دراندازی ہو رہی ہے۔کیسی پراگندگی پھیلی ہوئی ہے؟ جہاں کل پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا وہیں آج دنیا بھر کے بدمعاش، شہدے، چرسی، لچّے، لفنگے اٹھائی گیرے وغیرہ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے پیزار لے کر سینے پر سوار ہو رہے ہیں۔پوچھا پچھی کا زمانہ گزر گیا۔تھانہ کا پھاٹک دن رات فیلِ مست کی طرح جھوم رہا ہے۔حوالات میں پڑے چور اچکے جیب کترے وغیرہ دن میں سو فرمائشیں کرتے ہیں۔اب ان حرامیوں کو گانٹھ کا پیسہ خرچ کر کے چائے سگریٹ پلاؤ۔ان کے گھر والے دندناتے ہوئے آ کے میری کرسی کے برابر بیٹھ کر بڑی بدتمیزی سے ان کی رہائی

کا مطالبہ کرتے ہیں۔اب میں کیا کروں؟ پرچہ تو کٹ چکا ہے۔ منصفی تو بیٹھتی نہیں کہ جا کر حرامیوں کی ضمانت کرا کے آؤں۔کیا معلوم کل کلاں کو ان ہی میں سے کوئی بندوق اٹھا کے کنپٹی پر دھر کے ٹھائیں کرے۔ کچھ کو تو ہم نے فرار ہونے پر مجبور کیا۔ میں تو کہتا ہوں شاہ صاحب! اس قوم کو کینی بالزم (Cannibalism) ہو جائے گا۔لوگ ایک دوسرے کو کھائیں گے۔''

منشی غور سے یہ تقریر سن رہا تھا۔ پوچھا:

''حضور! یہ کہنا بولیرزم کیا ہوتا ہے؟''

تھانیدار نے بیزاری سے کہا:

''منشی جی! دو جماعتیں اور پاس کی ہوتیں تو آج کندھے پر دو ستارے ہوتے۔اس طرح ہمہ وقت گردن جھکا کر مسلوں پر رقم طراز نہ ہوتے۔بھئی کینی بالزم ایک بیماری ہے جو جانوروں کو لگتی ہے۔ایک دفعہ میرے چاچا کے پولٹری فارم میں یہ بیماری پھیلی تھی۔مرغوں کی خانہ جنگی میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔چنانچہ اس خون ریزی کو روکنے کے لئے مرغوں کی منقار تراشی کرانا پڑی۔''

تبھی کونے میں بیٹھے ایک چمار نے ہتھکڑیاں چھنکائے، کانوں کے مندرے ہلائے بے تکلف ہو کے پوچھا:

''اسو جی صاب (ایس۔ایچ۔او صاحب) یہ مرض کیا بواسیر سے بھی مہلک ہے؟ مجھے خونی بواسیر نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔تین گھنٹوں سے اوپر یہاں اکڑوں بیٹھا ہوں۔چوتڑوں کے بل نہیں بیٹھ سکتا۔''

یہ سنتا تھا کہ تھانیدار کا پارہ چڑھ گیا۔ تڑخ کر بولا:

"ابے او چمار کے بچّے! میں تیرے مقعد کے سارے غدود نکال کر خون کا وہ دڑہ کھول دوں گا کہ محلّہ بھر کی رضائیوں کی روئی کم پڑ جائے گی۔ حرام زادے! زوجہ کو کیوں اتنا مارا پیٹا؟"

چمار نے ہاتھ جھوڑتے ہوئے کہا:

"حضور خطا معاف۔ جوجہ (زوجہ) کو اپنی میں نے اس کی بہن کے لونڈے کے ساتھ رنگے ہاتھوں منہ کالا کرتے ہوئے پکڑا۔ جس وقت میں نے دروزہ کھولا دیکھتا کیا ہوں کہ دونوں کی ٹانگوں کی قینچیاں بندھ گئی ہیں۔ آپس میں گتھ گئے ہیں۔ جوجہ کا پاجامہ پنڈلیوں سے نیچے۔ مجھے آتا دیکھ کر جوجہ میری گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پاجامہ رنڈی کا پھسل کر ٹخنوں پر آ گیا۔ تس پر اپنے یار کے بال کھسوٹتے ہوئے کہنے لگی کہ موئے مردار! زبردستی کرتا ہے۔"

یہ سنتا تھا کہ تھانیدار آپے سے باہر ہوگیا۔ جم کے چمار کی پٹائی کی۔ چمار کو جتنی مار پڑ رہی تھی اس سے زیادہ وہ چیختا چلاتا تھا۔ شوروغل اس کا سن کے تھانہ کے صحن میں موجود لوگ تماشائی ہوئے۔ اہلکار ہٹاتے جاتے تھے کہ ہٹو ہٹو کیوں بھیڑ لگائی...... رستے سے بھی کچھ لوگ گھس کر اچک اچک کر تماشا دیکھنے لگے۔ تھانیدار غصّے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ اس کی باچھوں سے جاگ نکل رہا تھا:

"جوجہ کے بچّے! تو بیان دے رہا ہے کہ اپنی جوجہ کی پریم کہانی پر

مبنی فلم ''گپت گیان'' کی کہانی مزے لے لے کے ہمیں سنا رہا ہے؟ سالے بے حیا! کوئی دین دھرم تم چماروں کا ہے کہ نہیں؟ منشی جی ضمانت کے لئے کون آیا ہے؟''

منشی بولا:

''حضور! اس کا سسر آیا ہے۔ تصفیہ کرنا چاہتے ہیں۔''

تھانیدار نے چمار کو مزید دو چار طمانچے مار کر کہا:

''تو تصفیہ کر کے دفع کر دو نا اس گند کو یہاں سے.... ارے یہ شاہ صاحب کہاں اٹھ کے چلے گئے؟''

خواجہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ انہیں لگا جیسے کمرے میں ہزاروں بلب روشن ہیں اور وہ روشنیوں کے وسیع آسمان میں اندھیرے کا ایک پرکالہ ڈھونڈ رہے ہیں جس میں خود کو چھپا سکیں۔ یکایک وہ صحرا کے بیچوں بیچ کھڑے ہو گئے۔ دور ریت کے بادلوں کو چیرتا ایک لشکر شور مچاتا ہوا انہیں دکھائی دیا۔ سپاہیوں کے ہاتھوں میں نیزے تھے اور ہر نیزے پر ایک سورج چمک رہا تھا۔ انہیں لگا کہ یہ لشکر ان کے وجود پر یلغار کرنے کے لئے ہوا کی رفتار سے پیش قدمی کر رہا ہے۔ تبھی انہیں عقب سے تڑاکے کی صدا سنائی دی۔ پیچھے مڑے تو کیا دیکھا کہ دل دہلانے والے زلزلے کے زور سے ایک مہیب پہاڑ کے دو حصے ہو رہے ہیں۔ جیسے کوئی پھانے سے اس میں شگاف بنا رہا ہو۔ ایک درّہ وجود میں آیا۔ خواجہ دیوانہ وار

اس درّے کی طرف دوڑنے لگے۔ چھالے پاؤں کے پھٹ چکے تھے۔ ریت کے ذرے نیزے کی انی کی طرح جھلیوں میں گھس کے چبھ رہے تھے۔ دستار کھل کے گلے میں آویزاں ہوگئی تھی۔ پھٹی پرانی قبا کے لیر لیر چیتھڑے ہوا میں پھریروں کی طرح اڑ رہے تھے۔

درّے کے پاس پہنچ کر دیکھا کہ ایک خیمہ اس میں بوسیدہ نصب ہے جس کے اندر سے کسی کے کھانسنے کی آواز آرہی ہے۔ بے چینی میں خیمے کا پردہ اٹھایا۔ دیکھا کہ ایک شخص پہلے سے ہی وہاں سر پر سیاہ پگڑی باندھے، منہ ڈھاٹے کے پیچھے چھپائے بیٹھا اندر آنے کا اشارہ کر رہا ہے:

''اندھیرے کی تلاش میں بھٹکے ہو کہ روشنی سے بھاگ رہے ہو؟''

اس پراسرار شخص نے ڈراونی آواز میں پوچھا۔ وہ بری طرح کھانس رہا تھا۔ خواجہ نے ڈرتے، ہانپتے کانپتے اثبات اور نفی میں سر ہلایا۔ اس شخص نے اپنے منہ سے ڈھاٹا ہٹایا۔ اس کا منہ بھیڑئے جیسا تھا۔ ایک طرف چہرہ اس کا سیاہ دوسری طرف سفید۔ ایسی بھیانک صورت دیکھ کے خواجہ کے منہ سے ہیبت ناک چیخ نکلی۔

خواجہ کی آنکھ کھلی تو وہ پتلیوں کو گھما گھما کر اندھیرے میں ایک سیاہ دھبہ ڈھونڈ رہے تھے۔ اچانک انہیں کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ انہیں لگا کہ صحن میں بیٹھا کوئی کھانس رہا ہے........ وہ زینت کو جگائے بغیر رسان سے اٹھے۔ دبے پاؤں کھڑکی کے پاس گئے۔ پردہ سرکایا۔ دیکھا کہ باغیچے میں انار کے جھاڑ تلے محمود کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔ انہیں تعجب ہوا کہ

محمود کب سے سگریٹ نوشی کا عادی ہوا اور اس وقت آدھی رات کو وہ بیوی بچّے
کو چھوڑ کر اکیلے وہاں کیوں بیٹھا ہے۔ جی میں آئی کہ سیڑھیاں اتر کے اس
کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھے: ''بیٹا کون سا غم تمہیں کھائے جا رہا ہے؟'' مگر
اس واسطے احتراز کیا کہ زینت جاگ جائیں گی۔ کئی راتوں کی جاگی اب آرام
سے سو رہی ہیں۔ اگر اس معاملہ کی خبر ہوئی تو مزید فکر مند ہو جائیں گی۔ چنانچہ
جیسے اٹھ کے گئے تھے ویسے ہی واپس آ کر بستر پر لیٹ گئے۔ مگر نیند انہیں
مسلسل ڈرا رہی تھی۔

یہ سلسلہ کئی راتوں تک جاری رہا۔ صرف خواجہ کو خبر تھی کہ محمود رات کو
اکیلے میں اپنا غم دفع کرنے کے لئے انار کے جھاڑ تلے سگریٹ پھونکتا رہتا
ہے۔ انہیں اس بات کا احساس ہوا تھا کہ محمود کے پورے وجود میں لاوا ابل رہا
ہے جس کی آواز انہیں سنائی دیتی تھی۔ وہ اس بارے میں محمود سے بات کرنا
چاہتے تھے مگر ہمّت نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن جب سب رات کا کھانا کھا چکے تو
خواجہ نے محمود سے پوچھا:

''تو بیٹا! کب جانے کا ارادہ ہے تم لوگوں کا؟''

''کہاں؟'' محمود نے سر اٹھا کر تعجب سے پوچھا۔

''دوبئی اور کہاں؟ بھئی مقصود وہاں اکیلا پڑ گیا ہے۔ اس کی بھی فیملی
ہے۔ اور پھر اتنا بڑا بزنس سنبھالنا ایک آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ تم لوگ چلے
جاؤ اب۔''

''آپ کو اس حالت میں چھوڑ کے؟''

محمود کے لہجے سے لگتا تھا کہ وہ صاف انکار کر رہا ہے۔خواجہ نے سمجھاتے ہوئے کہا:

''دیکھو بیٹا! یہاں مجھے دیکھنے کے لئے سب لوگ تو ہیں۔تمہاری ماں ہے، نائیلہ ہے، حبیب اللہ ہے، رمضان کی فیملی ہے۔یہ سب میری دیکھ بھال کے لئے بہت ہیں۔اور پھر مجھے ہوا ہی کیا ہے؟''

محمود نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''میں چلا جاؤں دوبئ؟ اور لوگ کہیں گے کہ باپ کو اس حالت میں چھوڑ کر.......''

خواجہ نے غصے میں محمود کی بات کاٹی:

''ارے بھائی! میں نے کہا نا کہ میری دیکھ بھال کے لئے یہ لوگ کافی ہیں۔''

محمود نے باپ کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا:

''پاپا! صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ اس بات سے خائف ہیں کہ کہیں میں سرحد پار نہ چلا جاؤں۔''

یہ سن کر خواجہ ہڑبڑائے:

''نہیں تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے....... تمہارے بوڑھے والدین ہیں.............بیوی ہے، بچہ ہے، جوان بہن ہے....... تم ایسا نہیں کر سکتے......بولو تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

محمود نے اپنی بیوی صبا کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔جب وہ جا چکی

تو بولا:

"کیوں نہیں کرسکتا میں ایسا؟ کیا میرے سرخاب کے پر لگے ہیں؟ کیا میں پتھر کا بنا ہوں؟ کیا مجھے اپنی قوم کی بے بسی نظر نہیں آتی؟ کیا میرے دل پر آرے نہیں چلتے؟ کیا اس مٹّی کا میرے خون پر کوئی حق نہیں؟ کیا وہ جو گئے ہیں ان کے بوڑھے والدین نہیں؟ ان کے گھروں میں جوان بہنیں نہیں؟ ان کی بیویاں نہیں، بچّے نہیں؟"

یہ سن کر خواجہ تھر تھر کانپنے لگے انہیں لگا کہ ان کی ساری مملکت ان کے ہاتھ سے جارہی ہے۔ انہوں نے اپنی قرہ قلی سر سے اتار کے اپنے بیٹے کے پاؤں میں ڈال دی:

"محمود تمہیں سوال ہے اسلاف کی بزرگی کا ایسا مت کرنا۔"

محمود نے خاندان کی عزت اٹھا کے ماں کی گود میں ڈال دی اور مزید کچھ کہے بغیر دیوان خانے سے نکل گیا۔

اس رات خواجہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے خلا کو دیکھتے رہے۔ انہیں اپنے بیٹے کے کھانسنے کا انتظار تھا۔ وہ کئی دفعہ کھڑکی تک گئے، پردہ سرکایا۔ انار کے جھاڑ کے نیچے کوئی نہیں تھا۔ سناٹے میں کبھی کبھی گلی کے کتّوں کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ خواجہ نے سوچا آج میرا لال آرام کی نیند سورہا ہے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ آدھی رات کو محمود اپنی بیوی صبا سے رخصت لے کر اپنے بیٹے کا ماتھا چوم کے نکل پڑا تھا۔ کئی دن تک کسی نے کسی سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی۔ گھر میں ایک خاموش طوفان برپا تھا۔

کئی دن بعد شام کو خواجہ اپنی فیملی کے ساتھ دیوان خانے میں بستر میں تکیہ کے سہارے بیٹھے تھے۔ان کا پوتا عدنان بار بار ان کی گود میں بیٹھ کر ان کی چہرے کے ان حصّوں کو شہادت کی انگلی سے چھوتا تھا جہاں ڈاڑھی کے بال نوچ گئے تھے۔خواجہ کے منہ سے ہر بار سسکاری نکلتی تھی۔زینت بیگم اپنے پوتے کو کھلونا دکھا دکھا کر للچاتی تھیں مگر وہ ان کی گود سے ہمک ہمک کر اپنے دادا کی طرف لپکنے کی کوشش کرتا تھا۔اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔خواجہ نے رسیور اٹھایا:

''وعلیکم .... کہئے شاہ صاحب کیا خبر ہے۔اچھا اچھا! ہوں، ہاں۔جی جی! اچھا منظور احمد۔کون سکندر؟......... اچھا اچھا پاپا مستری کا بیٹا............ اچھا یہ جو قصاب ہے سامنے یہ اسی کا بیٹا ہے نا۔اور ماجد........ ٹھیک اچھا محمود بھی۔کپواڑہ سے خبر آئی ہے کہ کل سرحد پار کی ہے............ اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔جی شاہ صاحب! اب قدرے بہتر ہوں۔شکریہ۔وعلیکم۔''

خواجہ فون پر یہ باتیں کر رہے تھے کہ ان کا پوتا جسے دادی نے صوفے پر مشکل سے بٹھایا تھا اچھل اچھل کے نیچے گر گیا۔وہ چیخنے چلانے لگا۔زینت نے اسے فوراً گود میں اٹھایا۔خواجہ نے حواس باختہ ہو کر اپنے سر سے قرہ قلی اتار کے زینت کی طرف پھینک دی:

''زینت بیگم! اس ٹوپی کو ہمارے خاندان کے بزرگوں کے تبرکات کے ساتھ رکھو۔''

زینت بیگم پوتے کو سہلاتے ہوئے چیخ کر بولی:

''کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں؟''

''زینت بیگم!''

خواجہ کی آواز بھرائی:

''تم کیا چاہتی ہو کہ یہ اوچھے لوگ میرے بزرگوں کی نشانی کو اچھالتے روندتے رہیں۔ نہیں...... ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں اپنا سر کٹواؤں گا مگر........ صبا کو فوراً بلاؤ۔''

صبا کو نرگس نے چلاتے ہوئے بلایا تو وہ فوراً سیڑھیاں اتر کے نیچے آئی۔ خواجہ نے اپنے پوتے کو اٹھا کے صبا کی گود میں دیا اور روتے ہوئے کہا:

''صبا! میری بیٹی! اپنے لال کو سینے سے لگا کے رکھو۔ اس کی حفاظت کرو......... سنا تم نے؟ دوپہر کو آسمان پر دھند چھا گئی۔ معلوم نہیں کتنے پرندے گھروں کو لوٹتے ہوئے بے نام فضاؤں میں گم ہوجائیں گے........ مدت سے دیودار کی شاخوں پر کریال کرتے بھوکے خونخوار گدھ لاوارث لاشوں کی بساند سے جاگ اٹھے ہیں۔ وہ برف سے ڈھکے ہوئے ڈھلوانوں میں جھنڈ کے جھنڈ منڈلانے لگے ہیں۔''

یہ کہہ کر خواجہ کانپتے ہوئے فرش پر گر کے بے ہوش ہوگئے۔ زینت نائیلہ اور صبا تو سکتے میں آگئیں مگر رمضان، حبیب اللہ، نورزا اور نرگس نے کہرام مچایا۔

باغ بغیچوں میں قطعہ ہائے سبز بیوہ کی مانگ کی طرح اجڑنے لگے۔ شاخوں پر گلاب کی پتّیاں سوکھ کر چرمر ہوگئیں........ ہوا کے خشک جھونکے خاکروب کی طرح شب عروسی کی سحر کو دلہن کے جوڑے میں بندھے گجرے کی پتیوں پر جھاڑو پھیرنے لگے۔ بہار کا موسم اپنے ہاتھ پاؤں میں خون کی مہندی رچائے، دکھوں کی پازیب چھنکائے گزرنے لگا۔ صمد بٹ کے باغوں میں پیڑوں کی ڈالیوں پر سیب پک پک کے سڑ گئے۔ کھلیان میں ہوا خاک پھانک رہی تھی۔ رات بھیگتی تو کوئی پتہ ڈال سے گرتا۔ کھڑکنے کی آواز سن کر خالدہ کو لگتا کہ جیسے منظور نے آہٹ دی ہو۔ وہ دیوانہ وار کھڑکی سے جھانکتی۔ اسے سناٹے اور اندھیرے سے ہول آتا۔

ایک دن اسے شمع کا خط ملا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ پھاڑ کے خط کھولا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا:

''پیاری بھابی!

سلامِ مسنون کے بعد عرض ہے کہ منظور بھائی واپس آیا ہے۔ آج کل سوپور کے کسی علاقہ میں سرگرم ہے۔ ابو نے کچھ دن پہلے کسی خفیہ مقام پر ملاقات کی۔ کہتے ہیں سرتاپا بارود میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایک ہاتھ میں کلاشنکوف دوسرے میں تسبیح۔ تمہیں سلام بھیجا ہے اور فتح ونصرت کی دعا کی درخواست کی ہے۔

محمود بھی آیا ہے۔ سرینگر میں ہی ہے۔ مگر گھر نہیں آتا..... اس کا بڑا بھائی مقصود دوبئ سے اپنی فیملی کو ساتھ لینے آیا تھا۔ چاچا نے صاف انکار کیا۔ چاچی

اور نائیلہ بھی نہیں مانیں۔ صبا کو ساتھ لینا چاہتا تھا مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ یہ کیا بات ہوئی کہ محمود نہیں تو میں پاپا اور ماما کو اکیلا چھوڑ کے جاؤں؟ میں ان کے پاؤں میں پڑی رہوں گی........ ہرگز نہ دوبئی جاؤں گی نہ میکے۔ بہن! سچ پوچھو تو صبا مجھے بہت اچھی لگنے لگی ہے۔ مجھ سے روز ملنے آتی ہے..... میں اس کے بیٹے کو گود میں لے کر بس چومتی رہتی ہوں۔ مکھن سا ہے۔ بالکل باپ پر گیا ہے۔

اچھا ایک بات تو کہنا بھول ہی گئی۔ کچھ دن ہوئے کہ گلی میں کسی لڑکے نے ملٹری گاڑی پر گرنیڈ پھینکا۔ کئی ملٹری والے زخمی ہو گئے۔ انہوں نے اندھا دھند فائرنگ کی......... شجاعت علی درزی اور دو اور ہمسایوں کو گولیاں لگ گئیں..... قیامت برپا ہوئی۔ قادر کانچی گھبراہٹ میں جان بچانے کے لئے اوپر جا رہا تھا۔ پیچھے سر میں گولی لگی۔ ماتھے سے خون کی پچکاری نکل کر دیوار کو رنگین کر گئی۔ اسی چرخ چوں سیڑھی سے گر کے کوئلوں کے انبار پر ڈھیر ہوا۔ ہنگامہ ختم ہوا تو لوگ کونوں کھدروں میں سے نکل کر شہیدوں کی تجہیز و تکفین کی فکر کرنے لگے۔ شام ڈھلی تو کسی نے قادر کی دکان میں جھانکا۔ دیکھتا کیا ہے کہ قادر اوندھے منہ پڑا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ جسم کا سارا خون بہہ کے کوئلوں میں جذب ہوا ہے۔ چنانچہ مزارِ شہداء میں دیگر شہیدوں کے پہلو میں دفن ہوا۔

میں سوچ رہی تھی کہ اللہ ایسے غلیظ بندے کو کیسے اتنا عظیم درجہ دے سکتا ہے؟ یہی سوچتے سوچتے نیند آ گئی تو عجیب و غریب خواب دیکھا۔ دیکھتی کیا ہوں کہ اک باغ جنت کا ہے۔ جس کے بیچوں بیچ ایک نہر آبِ زلال کی بہہ

رہی ہے۔نہر میں کنول بلور کے ہیں۔آبی جانوروں کے پروں پر ہیرے موتی جڑے ہیں۔نہر کے کنارے ایک خیمہ زربفت کا نصب ہے۔جس میں پلنگ جواہر کار ہے۔پائے اس پلنگ کے ہاتھی دانت کے ہیں۔بستر پر پھولوں کی پتیاں رنگ رنگ کی بچھی ہیں۔اس پلنگ پر ایک دلہن جواہرات سے لدی پھندی، زرّیں لباس زیبِ تن کئے گھونگٹ کاڑے بیٹھی ہے۔اتنے میں دو بلّم برداروں نے کہ لباس جنہوں نے اطلس کا پہنا تھا، درِ باغ کھولا اور قادر حوروں کے ساتھ تاج یاقوت وعقیق کا سر پر لئے شہنشاہ کی طرح واردِ باغ ہوا........ فضا میں زرّے یاقوت اور زمرّد کے اڑنے لگے، گویا آسمان سے ستارے ٹوٹ کر زمین کو منوّر کر رہے تھے۔حوریں جو قادر کے جلو میں تھیں اپنے مرمری ہاتھوں سے قمقموں اور رنگ کی پچکاریاں چلا رہی تھیں۔حتّٰی کہ قادر نے خیمہ کا پردہ اٹھایا۔دلہن کے قریب گیا۔گونگھٹ اٹھایا۔ٹھٹھک کر رہ گیا۔حیرت سے اس کے منہ سے نکلا:

''کانچی! تم؟''

ابو سچ کہتے ہیں........ ظالم کی گولی سے مر گیا........ شہید ہو گیا۔

اور کیا لکھوں؟

تمہاری بہن

شمع شاہ

(تمام شُد)

OOOO

اظہارِ تشکّر

- شکریہ استاذی المکرم جناب پروفیسر ابو الکلام قاسمی صاحب کا جنھوں نے اس ناول کو حرف بہ حرف نہایت انہماک اور توجہ سے سماعت فرمایا اور مفید مشوروں سے نوازا۔ قاسمی صاحب نے میرے لئے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر مجھے ہمیشہ کے لئے احسان مند بنا دیا۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے ان کی مہمان نوازی اور برادرانہ شفقت کا شکر ادا ہو سکے۔ بھابی جان پروفیسر دردانہ قاسمی نے جس طرح ''سرسبز'' میں میرے قیام کے دوران میرا خیال رکھا اس کے لئے شکریہ وغیرہ کے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ بس میری یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ''سرسبز'' کو ہمیشہ سرسبز اور شاداب رکھے۔
- شکریہ اپنے محترم دوست جناب خالد حسین صاحب کا جنھوں نے اس ناول کے مسوّدے کی اوّلین قرأت کے بعد نہایت اہم نکات کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔
- شکریہ اپنے دوستوں جناب رفیق راز اور ڈاکٹر نذیر آزاد کا کہ جن کے زرّیں مشوروں کے بغیر اس ناول کا مکمل ہونا ناممکن تھا۔
- شکریہ اپنے برادر رفیق الحسن قادری (I.P.S) کا جنھوں نے بعض جگہوں پر میری رہنمائی کی۔ اسی نوع کی رہنمائی برادرِ مکرم جناب محمد

حسین بدرو (سابق سپرانٹینڈینٹ آف پولیس) نے فرمائی جس کے لئے ان کا بھی سپاس گذار ہوں۔

- اپنے دوست آزاد محمود آزاد کا بھی شکر گذار ہوں جنہوں نے بعض اصطلاحات کی وضاحت فرمائی۔
- شکریہ برادرم ڈاکٹر جوہر قدوسی، برادرم عبدالغنی قدوسی اور عزیزی پرویز احمد میر کا جن کا دستِ تعاون ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔
- شکریہ اپنی بیگم ریحانہ اختر کا۔ کیوں؟ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔
- شکریہ اپنے صاحبزادے سید محمد سبزان خطائی کا کہ برخوردار کو اس ناول کے مکمل ہونے کی سب سے زیادہ فکر تھی۔
- شکریہ ڈاکٹر مشتاق احمد قادری صاحب (شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی) کا جن کو اس ناول کے چھپنے کا بے صبری سے انتظار رہا۔
- شکریہ اپنے عزیز دوستوں پروفیسر اویس احمد، پروفیسر بلال احمد ڈار، پروفیسر یاسر ملک یاسر، پروفیسر امرجیت سنگھ کا بھی۔ خاص طور پر ڈاکٹر الطاف حسین پرا کا بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے بڑی مشکل سے آتشِ چنار برآمد کر کے کچھ دیر کے لئے مجھے مرحمت کی۔ خدا ان سب دوستوں کو سلامت رکھے۔
- شکریہ اپنے بھائی جان (سیّد غلام رسول خطائی) کا جن کی تربیت، نگہداشت اور بے انتہا محبتوں نے اس ذرّۂ خاک کو وجود بخشا۔ بھائی جان کا بارِ احسان تاحیات میرے سر پر رہے گا۔ خدا ان کا شفیق سایا

ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے۔ اس کے علاوہ شکریہ اپنے بھائی صاحب سید محمد شفیع خطائی کا جنہوں نے مجھے اپنے تجربات اور مشاہدات سے روشناس کر کے بے انتہا کرب اور تحیر سے دوچار کر دیا۔ قارئین اس کرب اور تحیر کو جا بجا محسوس کریں گے۔

علاوہ ازیں میں اپنے محترم دوست بشیر چرغ کا بھی سپاس گذار ہوں۔ میں اپنے عزیز دوست ''علی انفارا ہومز'' کے ڈائریکٹر مسٹر عرفان علی لون کا نہایت شکر گذار ہوں جس کی بے انتہا محبتوں نے مجھے جینے کا نیا طور سکھایا۔ ایسا سیلف میڈ جوان ہماری نو جوان نسل کے لئے ایک مثال ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے۔

شفق سوپوری

OOOO

FIRING RANGE

Kashmir 1990

(Novel)

by : Shafaq Sopori

شفق سوپوری ایک ممتاز اور منفرد شاعر کے طور پر کچھ اتنے مصروف ہیں کہ اُن کی دوسری متنوع صلاحیتیں نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے نثر نگار اور اردو فکشن کی روایت اور مضمرات کے رمز شناس بھی ہیں، جس کا بہترین ثبوت وہ گزشتہ برسوں میں ایک قابلِ توجہ ناول ''نیلیما'' لکھ کر دے چکے ہیں۔ شفق سوپوری کی افتادِ طبع: ''ہر لحظہ نیا ذوق نئی برقِ تجلی'' کے مصداق اپنے تخلیقی محرکات کے انکشاف کی متلاشی رہتی ہے۔ انہوں نے ''فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰'' کے نام سے تازہ ترین ناول لکھ کر ایک پختہ کار ناول نگار ہونے کا ثبوت فراہم تو کیا ہی ہے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ضمیر کی اِس آواز کا تعلق انسانی سروکار، سماجی ذمہ داری اور اخلاقی فریضے سے بھی ہے۔ کشمیر کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال جس طرح برصغیر کے دو ملکوں کی غیر فطری تقسیم کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہے اِس کی حرکیات کو فکشن سے بہتر طور پر کسی اور صنفِ ادب اور اسالیبِ اظہار میں پیش ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شفق سوپوری نے انسانی ضمیر کے ساتھ بحیثیتِ مجموعی اردو فکشن پر عائد اِس قرض کو چکانے کی کوشش کی ہے جو محض کشمیر پر ہی نہیں پورے برصغیر میں اردو کے بیدار مغز ادیبوں پر عائد تھا۔ مصنف نے اپنے شاعرانہ تخیل اور بیانیہ کی قوت کو بھرپور طریقے سے اِس ناول میں روبہ عمل لانے کی کوشش کی ہے۔ اِس بیانیہ کا واحد متکلم راوی بیانیہ کا حصہ بھی ہے اور پوری صورتِ حال سے فنی اور معروضی فاصلہ قائم رکھنے میں کامیاب بھی۔ اس ناول کے مرکزی کردار منظور احمد شاہ، خواجہ احمد قدوس، نور الدین شاہ اور قادر کانجی کے ساتھ ترلوک ناتھ کول اور کرتار سنگھ کے کردار کی پیش کش ایک طرف ناول نگار کے لبرل نقطۂ نظر کی عکاسی بھی کرتی ہے اور کسی نوع کے ابھرے طرزِ فکر کا اس پر عائد نہیں ہونے دیتی۔ مزید برآں یہ کہ زبان وبیان کی شگفتگی اور حسِ مزاح نے اس ناول کو حد درجہ قابلِ مطالعہ بھی بنا دیا ہے۔

راقم الحراف کو امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ یہ ناول اردو ناولوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل بھی ثابت ہوگا اور اپنے منفرد بیانیہ کی حیثیت سے ناقابلِ فراموش بن جائے گا۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی
''سر سبز'' علی گڑھ
۵۔ فروری ۲۰۱۹

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA